وہ شاہکار کتاب جو گزشتہ 50 سال سے نایاب تھی

شبلی کی حیات معاشقہ

مصنف: ڈاکٹر وحید قریشی

ترتیب و تہذیب: عرفان احمد خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شبلی کی حیات معاشقہ

مرتب : ڈاکٹر وحید قریشی

ترتیب و تہذیب : عرفان احمد خان

ٹی اینڈ ٹی پبلیشرز، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب کا نام	:	شبلی کی حیات معاشقہ
مصنف	:	ڈاکٹر وحید قریشی
ترتیب و تہذیب	:	عرفان احمد خان
اہتمام	:	عرفان احمد خان
کمپوزنگ	:	6304034
پروف ریڈنگ	:	عبدالغفور خان
ایڈیشن	:	دوسرا
قیمت	:	100 روپے
پرنٹر	:	شریف پرنٹرز، ریٹیگن روڈ، لاہور
ناشر	:	ٹی اینڈ ٹی پبلیشرز

31-S-101/E بینک کالونی سمن آباد

لاہور (پاکستان) فون: 7576894

واحد تقسیم کار

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ، لاہور

انتساب

جناب پروفیسر سیف اللہ خالد صاحب

کے نام

جن کی کتاب "دیباچے سے فلیپ تک"

اردو تنقید کی ایک انوکھی اور منفرد کاوش

ہے اور انہیں جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب

کے شاگرد رشید ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے!

عرض مرتب

انسان اپنی محبت سے پہچانا جاتا ہے یا صحبت انسان پر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اس بات کا کاغذی حد تک قائل تو میں پہلے سے تھا' مگر عملاً قائل اس وقت ہوا جب ڈاکٹر سلیم اختر کے حلقہ نیازمندی میں شامل ہونے کے بعد میرے اندر تنقیدی اور تحقیقی جراثیم خود بخود پیدا ہونے کے بعد اپنا اثر بھی دکھانے لگے۔ رہی سہی کسر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کی رفاقت نے پوری کردی۔ ناول نگاری کے ساتھ ساتھ میں نے تنقید و تحقیق کی ابتداء انتہائی خفیہ طریق سے کچھ یوں کی کہ ایک عرصے سے "شہاب نامہ" پر کچھ نوٹس لے رکھے تھے' انہیں باقاعدہ مرتب کرنے کا عمل شروع کردیا۔ آخر کتاب مکمل ہوکر جنوری 2001ء میں "شہاب نامہ کی حقیقت" کے نام سے شائع ہوگئی' جسے خوش قسمتی سے نہ صرف ادبی حلقوں میں سراہا گیا بلکہ عوامی سطح پر بھی اسے بہت پزیرائی نصیب ہوئی۔ یہ کام میرے ہاتھوں ہونا تھا ' سو ہوگیا۔ پھر یوں

ہوا کہ میں نے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کا مقالہ "نفسیاتی تنقید" پڑھا۔ مقالے میں جہاں اور بہت سا تحقیقی مواد تشنگان علم کے لیے موجود تھا وہیں ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کی بے باکانہ اولین کاوش "شبلی کی حیات معاشقہ" کا ذکر پرمسرت بھی موجود پایا۔ نتیجہ وہی نکلا جو عموماً ایسے تحقیقی مقالے پڑھ کر نکلتا ہے۔ میں کتاب کی تلاش میں نکلا۔ کتاب تو نہ ملی مگر کتاب کے حوالے سے رنگ برنگی کہانیاں ضرور سننے کو ملیں۔ یہ پتہ چلا کہ اپنے وقتوں (1950) میں اس کتاب نے بڑا تہلکہ مچایا تھا مگر علماء کے شور مچانے پر کتاب کے مصنف نے اپنی تصنیف اور اس کے مندرجات سے دستبرداری کا "سرد اعلان" کردیا۔ بلکہ مصنف نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے "تائب" ہوجانے پر خود اپنی ہی کتاب کو ان تمام لائبریریوں سے "غائب" کرا دیا جو ان کے یا ان کے دوستوں کے حلقہء اثر میں تھیں۔ پاکستان کی ادبی تاریخ میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا' جب مصنف نے اپنی تخلیق کے ساتھ "ناجائز" اولاد کا سا سلوک کیا۔ خان عبدالقیوم خان بھی ڈاکٹر وحید قریشی ہی کی طرح اپنی تصنیف سے تائب ہوگئے تھے۔ قصہ یوں ہوا کہ خان عبدالقیوم خان نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کی مدح سرائی اور ان کے محیر العقول کارناموں پر مبنی ایک کتاب تصنیف کی' مگر ایک وقت آیا جب دونوں کے سیاسی راستے جدا ہوگئے۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب خان عبدالقیوم خان صوبہ سرحد کے وزیراعلیٰ بھی بن گئے۔ انہوں نے بطور وزیراعلیٰ اپنا استحقاق استعمال کرتے ہوئے خود اپنی ہی کتاب پر "پابندی" عائد کردی۔ اس طرح وہ اپنا نام "ادبی گینز بک آف دی ورلڈ ریکارڈ" میں درج کرانے میں کامیاب رہے۔ پاکستان کا بابا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں فیلڈ مارشل ایوب خان قائد حزب اقتدار تھے اور ان کے سگے بھائی خان بہادر خان قائد حزب اختلاف۔ ہماری قومی تاریخ ایسے مضحکہ خیز واقعات

سے بھری ہوئی ہے' جن کا ذکر سوائے شرمندگی کے اور کچھ نہیں۔ ہاں تو ذکر ہورہا تھا ڈاکٹر وحید قریشی کی نایاب اور گم شدہ تصنیف "شبلی کی حیات معاشقہ" کا۔ تجسس پسندی اور تحقیقی حس نے مجھے کتاب مذکورہ کی تلاش پر مجبور کردیا۔ پورا لاہور چھان مارا' مگر کتاب کہیں سے دستیاب نہ ہوسکی' کہ یہ ڈاکٹر وحید قریشی کا اپنا شہر تھا۔ کتاب کی جستجو میں سرگرداں رہتے ہوئے میں نے مولانا شبلی نعمانی کی حسن پرستی سے متعلق اپنے طور پر جاننے کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے بمبئی گئے ہوئے تھے کہ ان کی ملاقات ایک بے ریش لڑکے سے ہوئی۔ اس لڑکے نے اپنا نام "مولوی ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی" بتایا۔ شبلی یہ سمجھے کہ یہ جن صاحب کا نام بتا رہا ہے' یہ ان کا لڑکا ہے۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ یہ لڑکا "لسان الصدق" جیسے معیاری رسالے کا ایڈیٹر ہے تو ان پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

وہ ایسے جواہر پاروں کو کھینچ کھینچ کر ندوہ میں لا رہے تھے۔ انہوں نے ابوالکلام آزاد سے بھی کہا کہ وہ ان کے ساتھ لکھنؤ چلے۔ وہ بھی ان سے ایسا متاثر تھا کہ ان کے ساتھ بندھا چلا آیا۔

اس کا طرز تحریر' اس کے سوچنے کا انداز' اس کی ذہانت و قابلیت ایسی تھی کہ مولانا کی خلوت و جلوت کا "ساتھی" بن گیا۔ اس ہیرے کو مزید چمکانے دمکانے کے لیے انہوں نے اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھا۔ (وضاحت کتاب میں آگے ملاحظہ فرمائیں) یہاں تک کہ اسے "الندوہ" کی ایڈیٹری تک سونپ دی۔

1905ء کے اسی سال میں ان کی دوسری بیوی نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بیوی کے انتقال کے بعد اگر آزاد کا ساتھ نہ ہوتا تو شبلی کا

سنبھلنا مشکل تھا۔ ندوہ کے کام بکھرے پڑے تھے اور وہ خود منتشر ہو گئے تھے۔

تقریباً ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد آزاد نے بھی رخت سفر باندھا اور امرتسر جا کر مشہور اخبار "وکیل" کی ادارت کے فرائض سنبھال لئے۔

مولانا پھر اکیلے رہ گئے۔ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے انہوں نے فارسی شاعری کی مکمل تاریخ "شعر العجم" لکھنے کا ارادہ کر لیا۔

اس کام سے اکتا کر وہ کبھی کبھی شیخ مشیر حسین قدوائی کے بنگلے پر چلے جاتے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ٹہلنے کے لیے نکلے تو قدوائی صاحب کے بنگلے پر پہنچ گئے۔ غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ پہلے تو انہوں نے سوچا واپس چلے جائیں لیکن پھر سوچا' شاید آنے والے شناسا ہوں' کچھ گفتگو ہی رہے گی۔

قدوائی بھی جیسے انہی کا انتظار کر رہے تھے۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوئے اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

"شاید کچھ اجنبی مہمان آئے ہوئے ہیں آپ کے در دولت پر۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔"

"صاحب ذوق مہمان ہیں۔ آپ سے مل کر خوش ہوں گے۔ نواب حبیرہ کی بیگم اور ان کی بہنیں ہیں۔ لکھنؤ گھومنے آئی ہوئی ہیں' میرے گھر قیام ہے۔"

"ارے' تو یوں کہئے خواتین ہیں۔ ان سے تو پردے کا مسئلہ ہوگا۔"

"ہندوستان میں دو چار ہی تو روشن خیال خاندان ہیں۔ آپ آئیے تو' وہ پردہ نہیں کرتی ہیں۔"

شبلی کو پھر بھی تکلف تھا۔ ایسی صحبتیں ان کے مزاج کے مطابق کہاں تھیں ، لیکن صاف انکار سے بھی دل شکنی ہوتی تھی۔

وہ قدوائی صاحب کے ساتھ ان کے مغربی طرز کے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

"یہ زہرہ بیگم ہیں۔ یہ بڑی رفیعہ بیگم' ہز ہائی نس نواب حبیرہ کی بیگم اور یہ عطیہ ہے۔" انہوں نے ایک شوخ شنگ سی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو اس وقت بھی شبلی کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ "اور آپ ہیں شمس العلما شبلی نعمانی۔"

اس تعارف کے ساتھ ہی سب کی آنکھوں میں احترام امنڈ آیا۔ عطیہ کی مسکراہٹ ہونٹوں ہی میں دبی رہ گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھی اور شبلی کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

شبلی ان کی بے پردگی پر ہی حیران تھے۔ اور پھر کسی خاتون سے ہاتھ ملائیں؟ انہوں نے ایک نظر عطیہ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں لیکن اتنی دیر میں وہ حسن و جمال کا ایک پیکر اپنے سامنے دیکھ چکے تھے۔ ذہانت' حسن اور شوخی ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ایسے ہی پیکر بنتے ہیں۔

عطیہ کو بھی فوراً احساس ہو گیا کہ اس نے مولانا کی طرف ہاتھ بڑھا کر غلطی کی۔

"دراصل ہم سب بہنیں آپ کی بہت مداح ہیں۔" عطیہ نے کہا۔

"بھئی' آپ لوگ کیوں مداح ہیں۔ کیا جانتی ہیں آپ لوگ میرے بارے میں؟"

پھر جس انداز سے عطیہ نے ان کے اہم کارناموں کو ایک ایک کر کے بیان کرنا شروع کیا تو وہ اس کی معلومات پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے بڑے بڑے لوگوں سے اپنی تعریف سنی تھی لیکن اس تعریف کا نشہ ہی کچھ اور تھا۔

"آپ تو بہت قابل نکلیں۔ ہمارے ہندستان میں صنف نازک کے پاس ایسا شعور کہاں ہے؟"

اب شرمانے کی باری عطیہ کی تھی۔ مولانا کی زبان پر اس کی تعریفیں تھیں۔ پلکوں کی جھالر آنکھوں پر ڈالے بیٹھی تھی۔

"شبلی صاحب! انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔" مشیر قدوائی نے کہا۔ "آپ نے حسن آفندی کا نام تو سنا ہوگا؟ یہ انہی کی بیٹی ہیں۔"

"آپ جاننے کی بات کرتے ہیں۔ وہ تو میرے محسن تھے۔ ترکی میں انہوں نے مجھے ایک بڑی مشکل سے نکالا تھا۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ تجدید ملاقات اس صورت میں ہوگی۔"

"نہیں مولانا! آپ بمبئی آکر ہمارے مہمان بنیں۔ ملاقات تو جب مکمل ہوگی۔" اس مرتبہ عطیہ کی بڑی بہن نے کہا۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ بمبئی تو آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی آیا تو ضرور حاضری دوں گا۔"

"آپ تو ان کے کہنے سے آرہے ہیں، جبکہ آپ کی سب سے بڑی مداح تو میں ہوں۔" عطیہ نے کہا۔

"مہمان ہم ان کے ہوں گے، لیکن بمبئی کی سیر آپ کے ساتھ کریں گے۔"

"پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم کل ہی بمبئی روانہ ہو جائیں گے۔"

"کل؟"

"جی ہاں، تاکہ آپ جلد از جلد بمبئی آئیں۔"

"آپ کل جائیں، پرسوں میں آجاؤں گا۔"

شبلی کے اس فقرے پر کوئی بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

شبلی وہاں سے اٹھے تو کسی اور ہی عالم میں تھے۔ ان کا شاعرانہ مزاج ان کی علمیت پر حاوی ہوگیا تھا۔ چلتے چلتے ایک شعر خودبخود موزوں ہوگیا:

غنچۂ ناشگفتہ چوں تا دامن آورد بہ من
تا دگر از اثر باد بہاری چہ شود

اور پھر گولا گنج پہنچتے پہنچتے پوری غزل ہوگئی اور غزل بھی کیسی رنگین اور عاشقانہ، جیسے حافظ کی روح ان میں حلول کر گئی ہو۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ بمبئی سے خط آگیا۔ یہ خط عطیہ نے لکھا تھا اور رفیعہ بیگم کی طرف سے تھا۔ انہیں بمبئی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔

بمبئی ان کے لیے نیا نہیں تھا لیکن اب ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پہلی مرتبہ جائیں گے۔

بمبئی کے علاقے بائی کلہ کے ایک ہوٹل میں ایک کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نیچے ٹریفک شور مچا رہا تھا لیکن اندر سکوت تھا۔ اس کمرے میں شبلی ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بھی فیضی خاندان کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ عطیہ جیسی ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی بار بار ان کے سامنے آرہی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے ان کی آنکھ لگ گئی۔

صبح سو کر اٹھے۔ ناشتا کیا اور تیار ہو کر نیچے اتر آئے۔

اب ان کا تانگا ماؤنٹ روڈ پر "ایوان رفعت" کی طرف رواں تھا۔

ایوان رفعت پہنچ کر انہوں نے ملازم کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔ رفیعہ بیگم خود ان کے استقبال کے لیے آئیں۔ پھر تو جیسے پورے گھر میں بہار آگئی۔ شبلی جیسے عالم فاضل کی آمد معمولی بات نہیں تھی۔

"عطیہ بیگم نظر نہیں آ رہی ہیں؟" شبلی نے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

"آپ کا سنتے ہی تیار ہونے کے لیے چلی گئیں۔ بس آتی ہی ہوں گی۔"

ان کے لیے کوئی تیار ہو رہا ہے۔ یہ سوچ کر ہی شبلی کو خود پر رشک آنے لگا۔

"آپ کو تو یہ سب عجیب سا لگ رہا ہوگا کہ ہم لوگ پردہ نہیں کرتے؟" نازلی بیگم نے جانے کیا سوچ کر ان سے سوال کر دیا۔

"میں ترکی میں بھی دیکھ کر آیا ہوں۔ وہاں شرم و حیا ہے' پردہ ایسا نہیں جیسا ہندوستان میں ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا۔ وہاں عورتیں عام باہر نکلتی ہیں۔ پھر مجھے کیوں تعجب ہونے لگا۔"

"آپ کے خیالات کتنے اعلیٰ ہیں' حالانکہ آپ...." بات درمیان سے کٹ گئی کیونکہ عطیہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ پیازی رنگ کی ساڑی اور ہلکا سا میک اپ۔ خوشبو کے جھونکے کی طرح وہ اندر آئی اور شبلی کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

"کسی اطلاع کے بغیر ہی آپ تشریف لے آئے۔"

"اچانک ملاقات کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

"اس اچانک ملاقات کے کئی معنی ہو سکتے ہیں؟"

"میں تو ایک ہی معنی سمجھتا ہوں کہ میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔"

"سر کے خطاب کے لائق تو آپ ہیں۔ ہمیں تو آپ کا آنا پرائز سے کم نہیں لگا۔"

"اچھا' اب یہ باتونی آ گئی ہے۔ میں ذرا کھانے کے لیے نوکروں کو ہدایات دے کر ابھی آتی ہوں۔" نازلی بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ان کے جانے کے بعد عطیہ بیگم بھی اٹھنے کے لیے تیار ہو گئی۔ "میں ذرا کپڑے بدل آؤں۔"

"ابھی تو آپ کپڑے بدل کر آئی ہیں۔"

"شاید یہ اچھے نہیں ہیں ورنہ آپ تعریف ضرور کرتے۔"

"اوہ! تو یہ بات ہے۔ سب کے سامنے تعریف کرتے ہوئے میں کیا اچھا لگتا۔"

"اب تو کوئی نہیں۔"

"اب آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" شبلی نے کہا۔ "اور آپ کا بمبئی بھی بہت اچھا ہے۔"

"ابھی آپ نے بمبئی دیکھا ہی کہاں ہے؟"

"محترمہ! آپ کو دیکھ لیا' بمبئی کو دیکھ لیا۔"

نازلی بیگم پھر کمرے میں داخل ہوئیں۔ شبلی کچھ اور کہنا چاہتے تھے لیکن رک گئے۔

نازلی بیگم کے آنے کے بعد گفتگو کا رخ پھر عورتوں کی آزادی کی طرف ہو گیا۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد شبلی نے کچھ دیر آرام کیا۔

اب چوپاٹی کی سیر کے لیے نکلنا تھا۔ عطیہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے کہا تھا' آپ مہمان میری بہنوں کے ہوں گے لیکن سیر میں آپ کو کراؤں گی۔ موریس گاڑی تیار تھی۔ ڈرائیور اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مولانا اور عطیہ پچھلی نشست پر۔

"اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے بمبئی میں؟ عطیہ نے شوخی سے کہا۔

"ندوہ کے جھگڑے جان کو نہ لگے ہوتے تو زندگی بھر کے لیے بمبئی میں رہ جاتا۔"

عطیہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "بمبئی اتنا پسند آیا؟"

"شہروں کی خوبصورتی تو وہاں کے رہنے والوں سے ہوتی ہے۔"

"شاید چوپاٹی آگیا۔" گاڑی رکتے ہی عطیہ نے کہا۔

ڈرائیور نے دروازہ کھولا۔ پہلے عطیہ باہر آئیں پھر شبلی۔

وہ بمبئی کئی مرتبہ آئے تھے لیکن ان سیرگاہوں سے ان کا کیا واسطہ۔ عطیہ کے ساتھ یہاں آئے تو دنیا ہی دوسری دیکھی۔ ساحلی ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے انہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں عطیہ سے بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ ساحل پر ٹہلتے ہوئے انہوں نے سمندر میں اٹھنے والی لہروں اور اپنے دل میں اٹھتے ہوئے طوفان کا کئی مرتبہ موازنہ کیا لیکن اپنی عمر اور علمی مرتبے کو دیکھتے ہوئے کھل کر اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

دوسرے دن انہیں لاپلو جانا تھا۔ عطیہ نے انہیں ان کے ہوٹل تک چھوڑ دیا۔

"کل میں آپ کو لینے آؤں گی۔"

شبلی اس وقت تو اپنے کمرے میں چلے گئے لیکن اب یہ کمرا انہیں بہت کھوکھلا لگ رہا تھا۔ انہوں نے غسل کیا اور اس مرتبہ اکیلے ہی باہر نکل آئے۔

دوسرے دن وہ عطیہ کے ساتھ لاپلو گئے۔ اشاروں اشاروں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔

اب جی بہلانے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔ انہوں نے اپنے دلی جذبات کو اشعار کے پردے میں بیان کرنا شروع کر دیا۔

من در انجام رہ عشق گر قسم درپیش
خنک آنکس کہ ہم ایں شیوہ ز آغاز گرفت

چہ عجب جلوہ گہ دوست شود دیدۂ من
کہ زخاک درش ایں آئینہ پرداز گرفت

***

اب تک ان کی شاعری قومی نظموں اور قصیدوں تک محدود تھی لیکن اب وہ کسی اور ہی کوچے کے مسافر نظر آ رہے تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ بدل گیا تھا۔ یہ غزلیں رنگ جذبات سے ایسی شرابور تھیں کہ رنگینیٔ حافظ کا گماں ہوتا تھا۔

ندوہ کی مصروفیات ایسی تھیں کہ بار بار بمبئی نہیں جا سکتے تھے۔ مجبور ہو کر خط کا سہارا لیا۔ اس طرف سے جواب آیا۔ پھر یہ سلسلہ جاری ہو گیا۔ معلوم ہوا عطیہ یورپ جا رہی ہیں۔ جب تک وہ بمبئی جانے کا ارادہ کرتے عطیہ روانہ ہو چکی تھی۔ انہوں نے فراق کی اس وقتی کوفت کو مٹانے کے لیے اپنے وطن "اعظم گڑھ" کا رخ کیا۔

شعر العجم کی تصنیف میں بار بار خلل پڑ رہا تھا۔ جہاں بھی جاتے اس کا مسودہ ساتھ ہوتا، لیکن وہ اطمینان میسر نہ تھا جو اس عظیم تصنیف کے لیے ضروری تھا۔ انہوں نے چاہا کہ اعظم گڑھ جا کر چند مہینے آرام سے رہیں اور اس کام کو پورا کریں۔

حسب معمول قیام شبلی منزل میں تھا۔ چند روز آرام کرنے کے بعد کتاب کی تصنیف میں مشغول ہو گئے۔

ایک روز کام میں مصروف تھے کہ کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔ اندر ایک تخت بچھا تھا جس پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ داہنی طرف نظر پڑی۔ بندوق رکھی تھی انہوں نے یونہی اسے اٹھا لیا۔ قریب ہی ان کی بہو بیٹھی تھیں۔

"لائیے میں اسے اندر رکھ آؤں۔" ان کی بہو نے کہا۔

"یہ بندوق ہے۔ عورتوں سے تو اٹھ بھی نہیں سکتی۔" انہوں نے مزاحاً کہا۔

"اب عورتیں اتنی کمزور بھی نہیں ہوتیں۔" ان کی بہو نے کہا اور بندوق ان کے ہاتھ سے لینا چاہی۔ غلطی سے ہاتھ بندوق پر پڑا اور بندوق سر ہوگئی۔ بڑے چھروں کی بندوق تھی اور پھر فاصلہ بہت کم تھا۔ نشانہ ٹھیک ان کے پاؤں پر لگا۔ ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہوگئی۔ ایک جھٹکا سا لگا۔ شبلی کی سمجھ میں بھی نہیں آسکا کہ ہوا کیا۔ بہو کی چیخوں سے کہرام برپا ہوگیا۔ بندوق چلنے کی آواز اور پھر یہ چیخیں۔ ملازم اور باہر کے بعض آدمی دوڑ کر اندر آ گئے۔ وہ ابھی تک پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔

ایک نوکر نے جوتے سے پاؤں نکلنا چاہا تو ایڑی جوتے ہی میں رہ گئی۔

"پاؤں پر پانی ڈالو" انہوں نے نوکر سے کہا۔

نوکر روتا جاتا تھا اور پاؤں پر پانی ڈالتا جاتا تھا۔ جب دیر ہوگئی تو شبلی نے پاؤں اوپر اٹھانا چاہا۔

"میرا پاؤں اٹھا کر تخت پر رکھو اور پاؤں کے نیچے تکیہ رکھ دو۔"

"سرکار! اب ہے کیا جو رکھا جائے۔"

اب انہیں معلوم ہوا کہ ان کا پاؤں بری طرح کٹ چکا ہے۔ خون بری طرح بہہ رہا تھا لیکن کسی کو ہوش نہیں تھا کہ خون روکنے کی کوشش

کرتا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد ان کا بیٹا آیا اور چھوٹا بھائی جنید سول سرجن کو ساتھ لے کر آگیا۔

"پاؤں اب جڑ نہیں سکتا' اسے کاٹنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے رائے دی۔

شبلی کو بے ہوشی کی دوا پلا کر بے ہوش کر دیا گیا۔ (شبلی کی سخت جانی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بے ہوش ہونے سے پہلے 80/90 تک گنتی گنی۔) چونکہ ہڈی اوپر تک ٹوٹ گئی تھی اس لیے نصف پنڈلی کاٹ دی گئی۔

یہ خبر پہلے ندوہ پہنچی اور پھر پورے ہندوستان میں تشویش اور سراسیمگی پھیل گئی۔ احباب اور معتقدین کے تار آنے شروع ہوگئے۔

شبلی ترے قوم پر بہت احسان ہیں
باتیں تری درد قوم کی درمان ہیں
اِک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر
اس ایک قدم پہ لاکھ سر قربان ہیں

(نواب سید علی حسن خاں)

ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دو ہفتوں میں زخم مندمل ہو جائے گا لیکن تین ہفتے گزرنے کے بعد بھی زخم خشک نہ ہوسکا۔ تکلیف اتنی تھی کہ رات رات بھر نیند نہ آتی تھی۔

تین مہینے گزر گئے تھے۔ وہ ابھی تک بستر علالت پر تھے لیکن اس عالم میں بھی شعر العجم کی تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب زخم اچھے ہوگئے تو اب مصنوعی ٹانگ کی ضرورت پیش آئی۔ لکڑی کا مصنوعی پاؤں بنوانے کے لیے وہ بمبئی گئے۔ یہاں پہنچتے ہی انہیں عطیہ بیگم کا خیال آیا مگر وہ تو یورپ میں ہیں۔ اگر ہوتیں بھی تو میں ان کے

ساتھ سیر کو کیسے نکلتا۔ میں تو اب پابدست دیگرے اور دست بہ دست دیگرے ہو چکا ہوں۔

وہ بمبئی آئے لیکن عطیہ تھی نہیں کہ ملاقات ہوتی۔ ناچار لکھنئو واپس آ گئے۔

یہ پاؤں صحیح نہیں ہوا تھا اور ابھی عادت بھی نہیں تھی۔ چلنے پھرنے میں بہت تکلیف ہوتی تھی۔

حیدرآباد کی مجوزہ یونیورسٹی کے سلسلے میں مشاورتی اجلاس تھا جس میں انہیں بھی بلایا گیا تھا۔

اس قیام کے دوران انہیں افسر الملک بہادر نے سرکاری کارخانے سے دوسرا پاؤں بنوا کر پیش کیا جو زیادہ آرام دہ اور ہلکا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو پاؤں کٹنے کے ساتھ دل سے حوصلے کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا۔ شبلی بھی چاہتے تو گوشہ نشیں ہو کر تصنیف وتالیف میں عمر گزار دیتے لیکن انہوں نے اس حادثے کو دوسرے پاؤں کی نوک پر رکھا اور ندوہ کے عملی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

اس وقت ان کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ندوہ کی عمارت ایسی ہو کہ دنیا کی درس گاہوں سے ظاہری حیثیت میں کسی طرح کم نہ ہو۔ اب تک یہ دارالعلوم ایک پرانے مکان میں قائم تھا جو کسی طرح اس کے شایان شان نہیں تھا۔

اس خواہش کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ ندوہ اور حکومت کے تعلقات میں کشیدگی کا خاتمہ ہو۔ ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو حکومت کے دل میں بیٹھ گئی تھیں۔

شبلی کا یہ بڑا کارنامہ تھا کہ انہوں نے اپنی پراسرار شخصیت اور جادو

بیانی سے حکام کے خیالات کو پلٹ دیا اور حکومت نے ابتدائی طور پر پانچ سو روپے ماہوار کی امداد دینا قبول کر لیا۔

***

عطیہ یورپ کے سفر سے واپس آ چکی تھی۔ ندوہ کے کاموں میں الجھ کر شبلی اسے خط لکھنا بھی بھول گئے تھے۔ کسی نے ہلکی سی چٹکی دل میں لی اور یہ الفاظ کاغذ پر اتر آئے۔

"ایک بے ریا دل' ایک مخلص دل' وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت پر مبارکباد قبول ہو۔"

تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک اور حقیر ہدیہ ہے۔ کیا ان دونوں چیزوں کو قبول کر سکتی ہو؟

اپنی تصویر جو تمہیں برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آ گئی ہے۔ بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔"

افسوس کہ دوسری طرف سے کوئی اشتیاق ظاہر نہیں ہوا۔ شبلی گھبرا کر بمبئی روانہ ہو گئے۔

عطیہ سے ملاقات ہوئی۔ گلے شکوے بھی ہوئے۔ معلوم ہوا عطیہ اور ایک دوسری مسلم خاتون ایک لیکچر کی تیاری میں مصروف ہیں۔ عورتوں کی آزادی کے موضوع پر لیکچر ہے جس میں مرد بھی شریک ہوں گے۔ بمبئی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ ہوگا۔

"اچھا ہوا آپ تشریف لے آئے۔ یہ تماشا آپ بھی دیکھئے گا۔"

"تماشا کیا' ہم تو آپ کو دیکھیں گے۔"

"ہم ایک ٹیبلو بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ آپ کا قلم اسے تحریر کرے اور ہم پیش کریں۔"

"آپ کہیں تو انکار کی جرأت کسے؟"

شبلی نے رفعت منزل میں بیٹھ کر ٹیبلو تیار کیا لیکن افسوس کہ والدہ کی بیماری کا تار پہنچ گیا اور تماشے میں شریک ہوئے بغیر ہی واپس آنا پڑا۔

اس محرومی کے باوجود وہ کئی حسین یادیں لے کر آئے تھے۔ اس مرتبہ انہوں نے ہمت کر کے ایک نئے طریقے سے عطیہ کو خطاب کیا۔

"معاف کیجئے گا۔ میں "آپ" کی جائے "تم" کا لفظ لکھوں گا۔ آپ کے لفظ میں بے گانہ پن ہے۔"

انیس بیس برس کے بعد عطیہ کی قربت نے انہیں غزل کا کوچہ یاد دلایا تھا۔ عطیہ کے ہمراہ چوپاٹی اور اپالو کی سیر بار بار یاد آتی تھی۔

کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپالو را

یہ غزلیں اتنی مست تھیں کہ جب ان میں سے بعض غزلیں شائع ہوئیں تو احباب کو اس بت کافر کی تلاش ہوئی جس کا صدقہ ایسی غزلیں تھیں۔

ساقی مست چو سوئے من مدہوش آید
ساغر از کف بہ نہد میکدہ بردوش آید
ایں غزل اول فیض اثر بمبئی است
باش تابادۂ ایں مے کدہ درجوش آید

***

من فدائے بت شوخ کہ بہ ہنگام وصال
بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

***

یہ محض شاعری نہیں تھی۔ ان کے دل کی آواز تھی۔ وہ اندر ہی

اندر عطیہ کو پسند کرنے لگے تھے لیکن اپنے مرتبے کو دیکھ کر حد سے زیادہ احتیاط برت رہے تھے۔ اس احتیاط ہی نے ان کے جذبوں کو شعلہ بنا دیا تھا۔ یہ شعلہ آگ بھی تھا اور پھول بھی۔ اسی لیے جب انہوں نے ان غزلوں کو شائع کیا تو اس کا نام "دستۂ گل" رکھا۔

عطیہ کی بہن زہرہ کو اطلاع دیتے ہیں:

"میرا چھوٹا سا فارسی دیوان (یعنی حال کی غزلیں) چھپا ہے۔ جی چاہتا ہے بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد شعر قلم سے نکل گئے ہیں۔ اس لیے ان کا پردے میں رہنا ہی مناسب ہے۔"

یہاں بھی یہی احتیاط اور اپنے مرتبے کا لحاظ پیش نظر ہے۔ ان کی زندگی ان دنوں دو مختلف کاموں میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف تو ان کی ذات تھی اور دوسری طرف ندوہ کے کام۔

سرکار سے مصالحت کے بعد اب انہیں یہ فکر تھی کہ کسی طرح اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جائے کہ دارالعلوم کی نئی عمارت کے لیے زمین خرید سکیں۔ اس غرض سے انہوں نے پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ بہار کے بعض شہروں کے دورے کیے اور امدادیں حاصل کیں۔

یہ مصروفیات اور عطیہ لکھنئو میں۔ انہیں صرف اطلاع ہے کہ وہ آئی ہوئی ہیں۔

"آج کل بمبئی کا مہمان حسن اتفاق سے یہیں ہے لیکن بد قسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کچھ اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ۔ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر منظر دنیا نے کب دیکھا ہوگا؟"

انہیں ملاقات کی فرصت نہیں لیکن سوچنے اور خط لکھنے کی تو فرصت

تھی۔ وہ خطوں کے ذریعے مسلسل اپنی حالت "وہاں" تک پہنچاتے رہے۔

"عطیہ! میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ پاتا ہوں اگر تم اس کو اپنی توہین نہ سمجھو۔ مجھ کو بے انتہا مسرت ہے کہ تم نے میری تشریح اور خود اشعار کو پسند کیا۔ ان اشعار کی داد دینے کو تم سے بڑھ کر کس کو حق ہے۔"

ان کی پسندیدگی اب عشق کا درجہ اختیار کرنے لگی تھی۔ کبھی وہ عطیہ کو نورجہاں بنا کر اشعار میں اس کے ذکر کی وجہ تلاش کرنے لگتے۔ کبھی اپنے اشعار کی تشریح کرکے موقع محل پیدا کرتے۔ کبھی اسے موسیقی کی تلقین کرتے۔

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو اجازت دو کہ لوگ تمہیں پوجیں۔"

انہیں اگر یہ ناز تھا کہ عطیہ جیسی خوبصورت لڑکی ان کی مداح ہے تو خود عطیہ کے لیے بھی مقام فخر تھا کہ شبلی اسے پسند کرتے ہیں' اس نے وقت کی قید سے آگے نکل کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جانا چاہا۔ شبلی سے فرمائش کی کہ وہ کوئی کتاب اس کے نام معنون کریں۔ احتیاط پھر شبلی کے راستے کا پتھر بن گئی۔ لوگ کیا کہیں گے؟

"عطیہ! تم سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام معنون کر سکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا لیکن کب آئے گا' اس کا فیصلہ میں آج نہیں کر سکتا۔"

***

ندوہ کی تعمیر کے لیے سرمائے کی فراہمی کے لیے ان کے دورے اور اپیلیں بے کار نہیں گئیں۔ سرمائے کی فراہمی کے بعد دریائے گومتی کے کنارے' نہایت دلفریب منظر کے روبرو زمین خرید لی گئی۔ یہ سب شبلی کی بے

پناہ کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ندوہ کا خواب حقیقت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

زمین کی خریداری کے بعد دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھنے کا مسئلہ تھا۔ شبلی کا خیال تھا کہ سنگ بنیاد عطیہ کی بڑی بہن' نازلی بیگم آف جنجیرہ کے ہاتھوں نصب کرایا جائے کیونکہ انہوں نے مالی امداد کی تھی اور آئندہ کی بھی امید تھی' لیکن علماء نے مخالفت کی اس لیے یہ خیال ترک کرنا پڑا۔ ہز آنر گورنر بہادرالملک کے نام قرعہ فال نکلا کہ ندوہ العلماء کا سنگ بنیاد وہ رکھیں گے۔

سنگ بنیاد کی رسم بڑی شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ اس کثرت سے لوگ جمع ہوئے گویا پورا ہندوستان امنڈ آیا ہو۔

نازلی بیگم جنجیرہ نے ایک کمرے کی تعمیر کے لیے ایک ہزار روپے بھیجے۔ جواب میں شبلی نے ایک قطعہ لکھ کر انہیں بھیجا۔ آخری شعر میں بڑی ترکیب سے عطیہ بیگم کا نام استعمال کرکے شاعرانہ حسن پیدا کیا۔

نازم کہ ایں عطیہ فیض امیرہ ایست
کا وازۂ سخاش بہ عالم رسیدہ ایست

سنگ بنیاد رکھے جانے کے بعد دارالعلوم کی مجوزہ عمارت کی تعمیر کا مرحلہ تھا۔ نگرانی کے لیے کمیٹی کی تشکیل' نقشے کی تیاری اور منظوری۔ یہ سب ایسے کام تھے کہ انہیں فرصت ملی دشواری تھی۔

عطیہ کا خط بہت دن سے نہیں آیا تھا اور جب آیا تو غضب کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ نہ معلوم کیوں اسے یہ برا معلوم ہوا تھا کہ شبلی نے اپنے ایک شعر میں اس کا نام استعمال کیا۔ شبلی نے جواب لکھا۔

"مدت کے بعد تم نے یاد کیا۔ دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہوگئے۔ مجھ کو حیرت ہے کہ تم یہ کیونکر سمجھتی ہو کہ یہ تمہارا نام ہے۔ عطیہ

کے معنی داد و دہش اور انعام کے ہیں۔ اسی معنی میں استعمال کرتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہی تمہارا نام ہے۔ غیر آدمی کیونکر جان سکتا ہے کہ میں نے تمہارا نام لیا ہے۔ بہر حال آئندہ نہیں لکھوں گا۔"

بات یہ تھی کہ عطیہ فیضی جب یورپ گئی تھیں تو ان کی ملاقات علامہ اقبال سے ہوئی تھی۔ وہ جب لوٹ کر آئیں تو اقبال کے خطوط ان کے نام آنے لگے۔ ان خطوط کی بے تکلفی بڑھتے بڑھتے "ڈیئر عطیہ" تک پہنچی تو عطیہ شبلی کی طرف سے اغماض برتنے لگیں۔ شبلی اس صورت حال سے بے خبر عطیہ کی خفگی کو تعریفوں سے بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔

"عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے' میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف و تعریف کا ایک شعر ہے۔"

"عطیہ! خدا ایسا موقع لائے کہ چند روز جنیرہ میں رہ سکوں یا بمبئی میں ماؤنٹ روڈ پر لیکن کیا اس کی توقع ہے؟"

آخر بار بار کے خطوں سے عطیہ پھر پگھل گئی چنانچہ اس نے لکھا۔

"جنیرہ آؤ اور جب چاہو واپس جاؤ۔"

یہ کوئی معمولی دعوت نہیں تھی جسے نظر انداز کرتے۔ خود ان کے اصرار پر یہ اجازت مل تھی۔ وہ ہر حال میں جاتے لیکن ندوہ میں ان کے خلاف ایک محاذ بن چکا تھا جو انہیں ان کے عہدے سے ہٹانے کے لیے کمر بستہ تھا۔ مولانا خلیل الرحمٰن اس کے روح رواں تھے۔

شبلی نے جب معتمدی کا عہدہ سنبھالا تھا تو ناظم کی جگہ خالی تھی۔ مولانا خلیل اپنے طور پر اپنے آپ کو قائم مقام سمجھتے تھے اور بالآخر وہ بطور حریف شبلی کے مقابل کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے شبلی کی بعض کمزوریوں (وضاحت کتاب میں آگے آئے گی) سے فائدہ اٹھا کر بہت سے علماء کو اپنے

ساتھ ملا لیا۔

شبلی کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام دو ایسی تصانیف تھیں جو علما کے نزدیک قابل اعتراض تھیں۔

شبلی دارالعلوم کی تعلیم میں جس قسم کی اصلاح چاہتے تھے' علماء کا طبقہ اس سے بھی نفرت کرتا تھا۔ شبلی انگریزی کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور علما کو اس ضرورت سے شدید انکار تھا۔ وہ علی گڑھ سے الگ ہو چکے تھے لیکن انہی ابھی تک علی گڑھ کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

شبلی کے مزاج میں جو برتری کا جذبہ تھا اس نے اس بات کی پروا ہی نہیں کی کہ ندوہ میں مختلف مذاق کے لوگ ہیں' انہیں ساتھ لے کر چلنا چاہیے۔ وہ اپنی رائے کو اہمیت دیتے رہے۔ اس طرح انہیں مرکزی حیثیت تو حاصل ہوگئی۔ ندوہ کا مطلب ہی شبلی کی ذات کو سمجھا جانے لگا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء ان کے خلاف ہوگئے۔ خود شبلی کو بھی یہ کہنا پڑا۔

"میرا نصب العین ایک مذہبی عام انجمن ہے۔ ندوہ ہو سکتا تھا لیکن وہ مولویوں میں پھنس گیا اور یہ فرقہ کبھی وسیع الخیال اور بلند ہمت نہیں ہو سکتا۔"

شبلی اس کش مکش میں گرفتار تھے لہذا عطیہ کی دعوت پر لکھنئو چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔

جب وہ نہیں گئے تو عطیہ کا خط آیا۔ اس نے انہیں کم ہمتی کا طعنہ دیا۔ انہوں نے خط لکھ کر اپنی مجبوریوں کا احساس دلایا۔

"تم کہتی ہو میں بدہمت ہوں۔ میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک۔ اگر پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔"

انہیں یہ خیال بھی ہوا ہوگا کہ الزامات میں کہیں ایک الزام کا اضافہ

نہ ہو جائے۔

اگست 1909ء میں انہوں نے ارادہ کیا۔ پھر نہ جا سکے مگر تابہ۔ ندوہ کے کاموں سے وقتی طور پر رہائی پائی اور ریاست جنجیرہ پہنچ گئے۔ اس ریاست کو جزیرہ بھی کہا جاتا تھا۔ عطیہ کی بہن نازلی رفیعہ بیگم یہاں کے نواب کو بیاہی ہوئی تھیں۔ عطیہ کبھی یہاں ہوتی تھیں کبھی یہ خاندان بمبئی آ جاتا تھا۔ ان دنوں وہ جزیرہ میں تھیں لہذا شبلی کو لامحالہ وہاں پہنچنا تھا۔

کہاں ندوہ کی خشک' تدریسی زندگی کہاں جزیرے کی یہ صحبت کہ عطیہ اپنی شوخی اور زندہ دلی سے جان محفل بنی ہوئی تھیں۔ شاہی محل' محل سے متصل باغ' عطیہ کے ساتھ چہل قدمی۔ رات کی رانی کی کیف آور خوشبو' عطیہ کی ہنسی کے گھنگھرو۔ یہ سب چیزیں ایسی نہیں تھیں جنہیں فراموش کیا جا سکے۔ اسی رات شبلی نے یہ قطعہ لکھا:

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہوگی تو کیوں ہوگی
خیالِ روزہ و فکرِ وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصر معلی میں
اسے خلدِ بریں کی آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوائے رُوح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی تو کیوں ہوگی

سرمستی اور سرشاری کی لہریں رہ رہ کر کروٹیں بدل رہی تھیں۔ فیضی خواتین کی مہربانیاں جاری تھیں۔ زہرہ بیگم سے اولی مباحث ہوتے تھے' نازلی رفیعہ بیگم سیاست میں درک رکھتی تھیں اور عطیہ اپنی شوخ طبعی سے شبلی کی اداس زندگی میں خوشیوں کی ایک نئی روح پھونک رہی تھی۔

ایک ہفتہ چٹکی بجاتے گزر گیا۔ اب یہ قافلہ بمبئی کی طرف رواں تھا۔ ایک مرتبہ پھر ماؤنٹ روڈ کی "رفعت منزل" مولانا کی پذیرائی کی آماجگاہ بن گئی۔

ایک دن انہیں خبر ملی کہ ان کی بیٹی فاطمہ سخت بیمار ہے۔ یہ کیسا امتحان تھا۔ ایک مرتبہ والدہ کی علالت نے بمبئی چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب فاطمہ بیمار ہے۔ کیا مجھے پھر لکھنؤ جانا پڑے گا؟

"کیا بات ہے' آج آپ بہت اداس ہیں؟" عطیہ نے پوچھا۔

"خبر آئی ہے کہ فاطمہ سخت علیل ہے۔"

"تو کیا واپس جائیے گا؟"

"تم کہو تو نہ جاؤں؟"

"میرا بس چلے تو میں کبھی آپ کو بمبئی سے نہ جانے دوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر میں یہ معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ میرے جانے یا نہ جانے سے کیا فرق پڑے گا۔"

"اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عطیہ نے کہا۔ "چلئے کہیں باہر چلتے ہیں۔ آپ کا جی بہل جائے گا۔"

"آپ کو میرا بہت خیال ہے؟"

"میں آپ کی مداح جو ٹھہری"

"صرف مداح؟"

"باقی جو کچھ ہوں' وہ آپ نے اپنے شعروں میں کہہ ہی دیا ہے۔"

"تو آپ میرے شعروں کی گہرائی تک پہنچ گئی ہیں؟"

"آپ کے ساتھ رہتے رہتے اتنی فارسی تو آ ہی گئی ہے۔"

"عطیہ! میں تم...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

"چلئے' کسی ہوٹل میں چل کر چائے پیتے ہیں۔"

"عطیہ! ہم نے جزیرے سے یہاں آ کر ایک قطعہ کہا ہے۔ تم بھی سن لو۔" شبلی نے ہوٹل کے ایک گوشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارشاد۔ اس میں یقیناً کسی کی تعریف ہوگی۔"

"تم "کسی" میں شامل نہیں ہو۔ بہر حال سنو۔"

یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی مے خانہ تھا
لطف تھا اذن سخن تھا صحبت احباب تھی
مطرب و رود و سرور ساغر و پیمانہ تھا
سبزۂ گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرت خلد بریں ہر گوشہ ویرانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

"کیا سوچنے لگیں؟" شبلی نے عطیہ کو خاموش دیکھ کر کہا۔

"یہ میں لندن سے واپس آ کر بتاؤں گی۔"

"کیا مطلب' تم لندن جا رہی ہو؟"

"جی ہاں' لیکن جلد ہی لوٹ آؤں گی۔"

"تمہاری مرضی۔ ویسے نہ جاتیں تو اچھا تھا۔ تمہاری وجہ سے میرا دل لگا ہوا تھا۔"

شبلی وہاں سے اٹھے تو کبیدہ خاطر تھے۔ یہ اداسی اس وقت اور گہری ہوگئی جب انہیں دوسری خبر یہ پہنچی کہ فاطمہ کا انتقال ہوگیا۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ جسے بیماری سمجھ رہے تھے اس کی موت بن جائے گی۔ اب انہیں لکھنئو لوٹنا پڑا۔

علمائے ندوہ سے اختلاف کا سلسلہ جاری تھا' لیکن وہ اس اندرونی سیاست سے بے پروا ہو کر دارالعلوم کی تعمیر کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے تھے۔ ایک طرف ریاستوں سے امداد کی منظوری کے لیے حیدرآباد اور بھوپال کے چکر کاٹ رہے تھے' دوسری طرف صاحب حیثیت افراد سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ تعمیر کا سلسلہ جیسے جیسے آگے بڑھتا جا رہا تھا' ان کی مصروفیات بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس وقت وہ اس دارالعلوم کے لیے وہی کردار ادا کر رہے تھے جو علی گڑھ کالج کے لیے سرسید ادا کر چکے تھے۔

اس مصروفیت میں وہ یہ بھی بھول گئے کہ عطیہ کب یورپ سے واپس آگئیں۔ انہیں تو اس وقت معلوم ہوا جب وہ لکھنئو آئیں اور ان سے ملے بغیر ہی لکھنئو سے چلی بھی گئیں۔ انہوں نے گھبرا کر خط پر خط لکھے لیکن دوسری طرف سے خاموشی تھی۔ بہر حال مدت کے بعد عطیہ کا خط آیا کہ وہ الہ آباد کی نمائش دیکھنے جا رہی ہے۔ وہ بھی الہ آباد کے لیے سوار ہوگئے۔

نمائش میں عطیہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بےتیمہ انداز تھی۔ وہ مہمان تھی اور مہمان کی تواضع تہذیب کا حصہ۔ شبلی نے اعلیٰ پکوان کا نہایت عمدہ خوان تیار کرایا اور ایک ملازم کے سر پر رکھ کر عطیہ سے ملاقات کو گئے۔

"مولانا! آپ نے یہ تکلیف کیوں کی؟"

"جب آپ ہماری مہمانداری کر رہی تھیں اس وقت ہم نے تو یہ نہیں پوچھا تھا۔"

"آپ تو ہمارے گھر ٹھہرے تھے۔"

"آپ ہمارے گھر نہیں ٹھہر سکتیں۔ اس لیے یہ شوق ہم یہیں پورا کیے لیتے ہیں۔"

"یہ دستر خوان اسی طرح آتا رہے گا۔"

انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ بلاناغہ دستر خوان آتا رہا۔ ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں لیکن اب ان ملاقاتوں میں وہ گرم جوشی نہیں تھی۔ انہوں نے کئی مرتبہ عطیہ سے گلہ کیا لیکن وہ گلہ ہی کر سکتے تھے۔ دوسری جانب ہر سوال کا جواب ایک قہقہہ تھا۔

نمائش ختم ہوئی اور وہ لکھنئو آ گئے۔ اب انہیں اپنی اور عطیہ کی عمروں کے فرق کا احساس ہونے لگا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک ہم راز کو خط لکھا:

"نہیں معلوم کہاں جاؤں۔ جزیرے کی کشش میں ذرا شبہ ہو گیا ہے۔"

انہوں نے "شبہ" کا لفظ استعمال کیا جبکہ معاملہ کچھ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔

اور ایک صبح مولانا کو معلوم ہوا کہ عطیہ کسی اور کی ہو گئی۔ اس نے ایک یہودی رحمن سے (مسلمان کرنے کے بعد) شادی کر لی۔

شبلی نے اپنے ہم راز مہدی حسن کو خط لکھا 'اور بڑے دکھ سے لکھا:

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل وخوار بنا دیئے گئے۔ کیا 5 دسمبر

1912ء کے بعد بھی' جس دن کہ.....ایک یہودی کے ہاتھ آئی۔"

پھر عطیہ کو لکھا۔

بتانِ ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اِک کافر مسلماں ہے

***

رحمن مصور تھے۔ غالباً عطیہ کے کہنے پر انہوں نے شبلی کا پورٹریٹ تیار کیا۔ اس کے جواب میں شبلی نے نہایت معنی خیز شعر لکھ کر انہیں بھیج دیا:

آرٹسٹ آپ ہیں اور حسن کی تصویر ہوں میں
آپ نے کھینچ لیا' مجھ کو تو مجبوری تھی

اس کے بعد مولانا' فیضی خاندان سے ملتے تو رہے لیکن جذبات کا وہ طوفان تھم چکا تھا۔

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را
طرازِ مسندِ جمشید و فرتاجِ خسرو را

***

مجھے باتوں باتوں میں کسی نے بتایا کہ وحید قریشی کی کتاب "شبلی کی حیات معاشقہ" راولپنڈی کے گورڈن کالج سے مل سکتی ہے' میں راولپنڈی پہنچ گیا۔ وہاں کے لائبریرین' نشاط صاحب نے میرے ساتھ تعاون کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی' کالج کی کیٹلاگ میں بھی کتاب کا نام موجود نہ تھا۔ انہوں نے شبلی اور ڈاکٹر وحید قریشی کی دیگر کتب میں میری مطلوبہ کتاب تلاش کرنے کی پوری کوشش کی مگر کتاب وہاں ہوتی تو ملتی۔ میں اس روز لائبریری سے جس طرح دل گرفتہ انداز میں نکلا' یہ میں ہی جانتا ہوں۔ راولپنڈی اسلام آباد کے سنگم پر میرے ایک دوست جلیل عابد صاحب رہتے

ہیں۔ وہ PTV لائبریری میں ملازم ہیں۔ میں ان کے گھر چائے پی رہا تھا 'تو باتوں باتوں میں ذکر ہوا کہ میں نے پورا دن "شبلی کی حیات معاشقہ" کی تلاش میں صرف کیا ہے۔ جلیل عابد صاحب مجھے اس وقت ادب کے دیوتا دکھائی دیئے' جب انہوں نے جواباً مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا: "کتاب میرے پاس موجود ہے' آپ فکر مند نہ ہوں۔" مجھے ان کی بات پر یقین نہ آیا اور میں نے انہیں فوری طور پر کتاب لا کر دکھانے کیلئے کہا۔ انہوں نے میری جانب چائے بڑھائی' جو ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ میں نے حد درجہ بے چینی ظاہر کرتے ہوئے کہا: "آپ پہلے کتاب لائیں۔ چائے میں بعد میں پیوں گا۔" جس پر جلیل عابد صاحب نے کچھ دیر بعد تلاش کر کے مجھے کتاب دوسرے کمرے سے لا کر دیدی۔ میں نے کتاب کا جائزہ لیا۔ فوٹو کاپی تھی۔ کتاب پر سیکرٹریٹ لائبریری کی مہر ثبت تھی۔ میں نے جلیل عابد صاحب سے درخواست کی کہ وہ مجھے کتاب کی فوٹو کاپی کرادیں۔ یہ سن کر انہوں نے مجھے کتاب عنایت کردی اور کہا: "میں دوبارہ فوٹو کاپی کرا لوں گا۔ آپ کتاب لے جائیں۔" اتنی جدوجہد کے بعد "شبلی کی حیات معاشقہ" مجھے دستیاب ہوئی۔ لاہور پہنچ کر میں نے کتاب کا پوری توجہ اور دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ مطالعے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ اگر میں اس کتاب کی خاطر اتنا تڑپا ہوں تو دیگر ادبی شائقین کا کیا حال ہوگا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ آج ہم مذکورہ کتاب کی اشاعت کے پورے 50 برس گزر جانے کے بعد آزادی اظہار کے اس پُرمسرت مقام پر ہیں جب "حمودالرحمن رپورٹ" جیسی "خفیہ" چیز بھی منظر عام پر آچکی ہے تو پھر اس کتاب کا کیا قصور ہے کہ وہ گمنام رہے؟ آخر ناجائز بچوں کو بھی تو کوئی سینے سے لگا ہی لیتا ہے اور پھر پالتا بھی ہے۔ سو میں نے اس کتاب کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا۔ میں یہاں ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کے مقالے "نفسیاتی تنقید" کے اس حصے کا اقتباس

اپنے قارئین کے لیے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں' جس نے مجھے کتاب کی تلاش اور پھر اشاعت پر مجبور کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر صاحب اپنے مقالے "نفسیاتی تنقید" میں رقم طراز ہیں:

"پاکستان میں ڈاکٹر وحید قریشی' ریاض احمد اور سجاد باقر رضوی نمایاں ہیں۔ جب کہ بھارت میں سید شبیہ الحسن 'ان فرید' ڈاکٹر شکیل الرحمان' دیوندراسر' ڈاکٹر سلام سندیلوی اور ڈاکٹر محمود الحسن رضوی وغیرہ نے نفسیاتی تنقید کے سلسلے میں کام کیا ہے۔ یہ تو وہ نام ہیں جن کے بغیر نفسیاتی تنقید کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے ایسے اہل قلم بھی ہیں جنہوں نے متفرق موضوعات پر بہت اچھے مقالات سپرد قلم کیے لیکن وہ کتابی صورت میں طبع نہ ہوسکے۔ سو آج ان کا نام رسالوں کی فائلوں تک محدود ہے۔ اردو میں نفسیاتی تنقید کے ضمن میں کیے گئے کام میں نہ تعداد کی کمی ہے اور نہ معیار کی۔

اردو ناقدین کا تذکرہ زمانی یا مکانی لحاظ سے نہیں بلکہ مختلف نفسیاتی داستانوں اور ان سے وابستہ مخصوص تنقیدی رجحانات کے حوالے سے کیا جارہا ہے' اس لیے یہاں صرف فرائڈ سے متاثر ناقدین کا ذکر کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان ناقدین میں سے ایک ہیں۔ نفسیاتی تنقید کے اہم ترین مباحث میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تخلیق کار کی نجی زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور جذباتی حوادث کی روشنی میں اس کی تخلیقات کے نفسیاتی مطالعے سے یہ واضح کیا جائے کہ مخصوص نفسیاتی کیفیات نے تخلیقات میں کیسی کیسی رنگ آمیزی کی ہے۔ نفسیاتی نقطہء نظر سے دیکھیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو ادب میں حالی اور شبلی کی وجہ سے سوانح عمری کے جس انداز نے فروغ پایا' اس کی اساس نفسیات تو درکنار حقیقت پرستی پر بھی استوار نہ تھی۔ اس

کی سیدھی سی وجہ شخصیت پرستی کے رجحان اور بزرگوں کے احترام میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ انداز حالی کے ہاں بے حد نمایاں ہے۔ چنانچہ "حیات جاوید" کے دیباچے میں انہوں نے خود ہی یہ کہا ہے کہ موجودہ زمانہ کریٹیکل بائیو گرافی لکھنے کا نہیں۔ شبلی نے غالباً حالی ہی پر چوٹ کی ہے:

"ہمارے زمانے میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کا یہ عذر کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کی یہ حالت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں۔ لیکن عذر کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کرتے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے وہ ایشیائی شخصیت پرستی ہے جس کا اثر قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔"

سید سلیمان ندوی مکاتیب میں لکھتے ہیں:

" انسان کی بڑی سے بڑی سوانح عمری اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا، کا اہتمام کیا جائے تو سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑ دینے پڑیں گے۔ بیچ بیچ میں ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جائیں گے۔"

حالی اور سید سلیمان ندوی کے مقابلے میں شبلی کا رویہ زیادہ آزادانہ، عقلی اور غیر جذباتی ہے اس لیے وہ حالی پر اعتراضات بھی کرتے تھے۔ لیکن انہیں یہ علم نہ تھا کہ خود ان کی اپنی سوانح عمری کے بعض مخفی ابواب نفسیات کی روشنی میں کچھ اس انداز سے قلمبند کیے جائیں گے کہ وہ ایک طویل علمی نزاع کا باعث بننے کے ساتھ ساتھ خود شبلی کے امیج کو بھی ایک نئی صورت عطا کریں گے۔ یہ کتاب "شبلی کی حیات معاشقہ"۔ اس کے مولف ڈاکٹر وحید قریشی کے بیان کے مطابق 1941ء میں ایک مقالے کی صورت میں اسے

حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا تھا۔ بعد ازاں یہ ماہنامہ "کتاب" اور "اردو دنیا" (مئی 1946ء) میں طبع ہوا اور پھر ترمیم اور اضافے کے بعد 1950ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس مقالے نے خاصے نزاع برپا کیے جن کی نوعیت علمی کم اور جذباتی زیادہ تھی۔ چنانچہ ابتدائیہ میں وحید قریشی کے بقول:

"..... گمنام خطوط میں دھمکیوں سے اس بات کا اعلان کیا گیا کہ میں علامہ شبلی کی عظمت کو کم کرنے کے درپے ہوں ..... جنگ عظیم 1914ء سے پہلے کی یہ پود جن کے فتوے مجھ تک پہنچے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی مجبور ہے، کیونکہ مشرق و مغرب کے تمدن کی آویزش میں جس چیز کا پلہ بھاری رہا، وہ اخلاقی قدروں کی ظاہری پابندیوں سے ایک ان سمجھی اور ان بوجھی محبت تھی، جس میں عقل سے زیادہ جذبات کو دخل ہوتا ہے۔"

اس نرگسیت سے جنم لینے والے نفسی الجھاؤ نے مل کر شبلی کی شخصیت میں جن تضادات کو جنم دیا اور اپنی تسکین کے لیے جس نوع کی محبتوں کو اپنایا، ان کا وحید قریشی نے ان الفاظ میں تجزیہ کیا ہے:

" مولانا کی دوہری محبت بڑی مرکب سی ہے۔ ندوہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام میں دلچسپی اور پھر عطیہ بیگم کے ساتھ لگاؤ۔ آزاد کی محبت اور اس کے ساتھ ہی عطیہ بیگم سے محبت۔ عطیہ کے عشق کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ اگر ایک طرف انہیں ندوہ عزیز ہے تو دوسری طرف عطیہ۔ لیکن آپ دونوں کو ساتھ ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ان کے اشعار سے جنسیت کی بو آتی ہے، تو دوسری طرف وہ عطیہ کے ساتھ جانماز کا تعلق پیدا کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کبھی اسے دینی باتوں

کی طرف متوجہ کرتے ہیں ' کبھی حج کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سارے بظاہر تضاد کو اگر آپ اس زاویے سے دیکھیں جس کا اظہار کیا جاچکا ہے تو شبلی کی شخصیت میں ہمیں کوئی تضاد اور کوئی ثنویت نظر نہیں آتی۔ان کی نرگسیت ایک لڑکے میں اپنا بدل تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہے اور اسی طرح ایک مردانہ صفات کی عورت ("مردانہ صفات کی عورت"عطیہ بیگم کے لیے لکھا گیا ہے ۔ اس ضمن میں وحید قریشی نے ایک اور موقع پر بتصریح لکھا: " شبلی سلطان جمال کو اشارے کنائے سے سمجھاتے رہے اور اس میں ان مردانہ صفات کا سراغ لگاتے رہے۔ ایک دفعہ تو کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کرگئے۔ عطیہ کی مردانگی ان کی نرگسیت کے باعث محبت پر مجبور ہوتی رہی۔ مولانا نے بقول حالی گرما گرم اشعار کی تشریح عطیہ کو ایک خط میں لکھی اور یوں رقم طراز ہیں: "مردانہ تعلیم میں' میں ہارا اور تم جیتیں۔ لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ پاتا ہوں ' گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو") ان کی محبت ان کی شاعری کا موضوع بنتی ہے۔ یہی ان کی روداد محبت ہے اور یہی ان کی نرگسیت کا سیل رواں جو بیک وقت ندوہ کے ریگزاروں میں بھی بہتا ہے اور عطیہ کے دوپٹے اور ابوالکلام کی دستار کو ایک ہی لڑی میں پروتا جاتا ہے۔"

وحید قریشی نے شبلی اور دیگر اصحاب کے خطوط وغیرہ کی امداد سے

شبلی کی جو نفسیاتی تصویر مرتب کی ہے اس میں جنس مرکزی کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔یہ جنس کئی روپ دھارتی ہے۔ کبھی عطیہ بیگم کی محبت ہے تو کبھی ابوالکلام کی' چنانچہ خود شبلی کے بقول :

"ہاں انہیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔"

نابکوف کے مشہور ناول "لولیطا" کی اصطلاح کے بموجب شبلی بیوی کو "نیفٹ" کے روپ میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ چنانچہ دوسری شادی جس سے ہوئی وہ "عمر میں مولانا سے بہت چھوٹی تھیں۔ اتنی چھوٹی کہ مولانا اس بات پر راضی تھے کہ شادی کے بعد کچھ وقت مجردی میں گزار دیں۔" وہ صنف لطیف کی صحبت کے بھی شائق ہیں۔ چنانچہ " مہدی حسن سے انہوں نے لاکھ کہا کہ وہ انہیں اپنے گھر بلائیں اور اپنی نئی بیوی سے تعارف کرائیں ' لیکن وہ کچھ بدل گئے تھے ' اس لیے کہ عطیہ کے معاملے میں رازدار وہی تھے۔" یہ ہیں وہ تمام جنسی عوامل جنہوں نے ادھیڑ عمری میں شبلی سے نہایت گرم قسم کے فارسی اشعار کہلوائے۔ شبلی کے عشق کا جہاں تک اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے اس کی نوعیت کم و بیش جنسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی کو کہنا پڑا کہ ان کی غزلیں گرما گرم ہیں اور حالی یوں گویا ہوئے:

"کوئی کیوں کر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے ۔ ں نے "سیرت النعمان" "الفاروق" اور "سوانح مولانا روم" جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں' شراب دو آتشہ ہے جس کے نشے میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے ' ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں بہت گرم

ہیں۔"

(ملاحظہ ہو "علامہ شبلی کے نام مولانا ابوالکلام کے چند خطوط" از ابو علی اعظمی، مطبوعہ نگار، اکتوبر 1959ء)

فارسی کے کئی اشعار درج کرنے کے بعد وحید قریشی نے لکھا ہے:

"یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اگر مولانا کا عشق لول لول تجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتداء ہی سے نمایاں تھا۔ ہم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ اشعار سوچ چار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ہیں اور ان کے تخیل کی بیباکی پر دال ..... یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا عشق کامیاب ہو چکا تھا۔ بمبئی آتے تو مس عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا لیکن سر سید ملنے کی خواہش انہیں کب دم لینے دیتی تھی۔ ندوہ کے خشک کاموں میں الجھتے اور بری طرح الجھتے۔"

شبلی اور عطیہ کے موضوع پر محمد امین زبیری نے بھی "شبلی کی رنگین راتیں" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان کی شاعری پر اس عشق کے اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ لیکن انداز استدلال نفسیاتی نہیں۔ محمد امین زبیری ہی نے "ذکر شبلی" کے نام سے شبلی کی ایک مختصر سی سوانح عمری بھی لکھی ہے۔"

ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریر کا اقتباس آپ نے پڑھ لیا، جس کے بعد کتاب کے بارے میں میرا مزید کچھ کہنا بے معنی سی بات ہے۔ میں ڈاکٹر وحید

قریشی صاحب کو آج بھی اس جرأت مندانہ کاوش پر داد دینا اپنا فرض خیال کرتا ہوں، جبکہ یہ فرض، قرض میں تبدیل ہوا چاہتا تھا۔ اس کتاب کا ایک عنوان: "دو ملاوس (شبلی اور اقبال) میں مرغی (عطیہ) حرام" بھی ہو سکتا تھا، مگر میں نے سابقہ عنوان حال رکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل فارسی اشعار کے ترجمے اور پروف پڑھنے کے لئے میں جناب عبدالغفور خان صاحب کا خصوصی طور پر مشکور ہوں۔

اپنے قارئین کی گراں قدر رائے کا ہمیشہ کی طرح منتظر، اس اعتراف کے ساتھ کہ اگر یہ "جرم" ہے تو میرا ہے اگر یہ "جسارت" ہے تو میری ہے۔

نیازمند
عرفان احمد خان
31-S-101/E بنک کالونی
سمن آباد، لاہور (پاکستان)
فون: 7576894

عرض مصنف

یہ مقالہ اب سے چار سال قبل " حلقہ ارباب ذوق " میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد اسی سال "کتاب" اور پھر "ادبی دنیا" میں شائع ہوا۔ اب اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

اس کی اشاعت سے میرا مقصد بعض نے یہ فرض کرلیا اور اسی پیش خیالی کے ساتھ انہوں نے اس مضمون کا جائزہ لیا اور گمنام خطوط اور دھمکیوں سے اس بات کا اعلان کیا۔ کہ میں علامہ شبلی کی عظمت کو کم کرنے کے درپے ہوں۔ میں ان بزرگوں کے خطوط کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔ جنگ عظیم 1914ء سے پہلے کی یہ پود جن کے فتوے مجھ تک پہنچے اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی مجبور ہے کیونکہ مشرق و مغرب کے تمدن کی کویرش میں جس چیز کا پلہ بھاری رہا وہ اخلاقی قدروں کی ظاہری پابندیوں سے ایک ان سمجھی اور ان دیکھی محبت تھی جس میں عقل سے زیادہ جذبات کو دخل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ لوگ سمجھلاہٹ میں حق بجانب ہیں۔ اب یہ حضرات زندگی کی اس منزل پہ

پہنچ چکے ہیں جہاں اگر کسی اصلاح کی ضرورت ہو بھی تو اسے تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اس گروپ میں کچھ ادھیڑ عمر کے لوگ بھی شامل ہیں۔ یہ پچھلے گروہ کا منطقی نتیجہ تھے اتفاق سے ان کی سوجھ بوجھ نے دلائل کا سہارا بھی لینا شروع کردیا ہے۔ لہذا ان کے اقتباسات کا مضمون کے آخر میں جواب دینا مناسب سمجھا گیا ہے۔

تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے "شبلی کی حیات معاشقہ" سے بڑے خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا اور میرے بیانات کی تائید کی۔ لیکن ان کی تائید، تائید سے آگے نہ جاسکی۔ یہی اس مضمون کا افسوس ناک پہلو ہے جس نے آج مجھے یہ دوبارہ شائع کرنے پر مجبور کیا ہے۔

میں علامہ شبلی کی عظمت کا معترف ہوں۔ اگر آپ مجھے زیادہ مجبور کریں گے تو میں انہیں Genius بھی کہہ دوں گا یہ دوسری بات ہے کہ اس لفظ میں کسی تنقیدی رجحان کا مطلق کوئی پتہ نہیں چلتا۔ میں ان کی تاریخ دانی کا بھی قائل ہوں۔ میں انہیں ایک واجب الاحترام نقاد بھی تسلیم کرتا ہوں۔ عین ممکن ہے آپ کو مجھ سے ان کی ان خوبیوں کے سلسلے میں اختلاف ہو۔ وہ ایک شاعر بھی تھے۔ اور یہی میرے مضمون کا نقطۂ آغاز ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کے دو انداز میرے سامنے تھے۔ایک تو یہ کہ میں سلاست روانی ،جوش بیان کے چوکھٹے لگا کر اسی بے روح تنقید کا مظاہرہ کرتا جسے حالی اور شبلی کے فوراً بعد آنے والے تاریخ ادب کے مصنفوں نے پیش کیا اور اپنے احترام کی خاطر اسے قابل فخر بھی سمجھا۔ اس طریق تنقید میں جدت عموماً یہ ہوتی تھی کہ غالب کو گوئٹے ، نظیر اکبر آبادی کو شیکسپیر ،اور حالی کو شیخ سعدی سے ٹکرا دیا جاتا تھا۔ جس سے لکھنے والے اپنے ضمیر کی ملامت سے تو بچ جاتے

تھے ، لیکن تنقید کا میدان 1940ء تک چٹیل رہ گیا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی روشنی میں ان کی شاعری کا رنگ دکھاتا۔ اسی انداز کو میں نے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ منویدین شبلی کے کردار میں تضاد تو دیکھنے لگ گئے ، اور لذت کے پہلوؤں پہ ان کی نگاہیں تو جم گئیں لیکن شبلی کی شاعری جسے جا طور پر اس مضمون کے بعد موضوع گفتگو ہونا چاہئے تھا ، پس پشت ڈال دی گئی۔

اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ تطاول شم زلف دراز کی بات حرم سرا کی دیواروں تک پہنچ گئی ، اور خود محترمہ فیضی کو میدان میں اترنا پڑا۔ بہر حال "ادیبوں کے اس مشغلے" کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ عطیہ بیگم کے رد عمل کا ہمیں علم ہو گیا اور اب ہم اپنے موضوع کے تمام گوشوں کو بے نقاب دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ عطیہ صاحبہ نے اپنے نام علامہ اقبال کے خطوط بھی پبلک کے حوالے کر دیئے ، اور اپنی ذاتی ڈائری شیخ اکرام کے ہاتھ میں دے دی۔ اس عمر میں ادب کی یہ خدمت گزاری بڑے دل گردے کا کام ہے۔

اس بحث میں عطیہ بیگم کے علاوہ شیخ اکرام (شبلی نامہ) عبدالرزاق (یاد ایام) خالد حسن قادری (رسالہ نگار) نیاز فتحپوری (رسالہ نگار) امین زبیری (شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق) قاضی عبدالغفار (اخبار پیام) عبدالماجد دریا آبادی (اخبار "اصلاح") مولوی احمد کمی (رسالہ ہماری کتابیں) اور بمبئی کے بعض ہفتہ وار اخباروں نے حصہ لیا۔ میں ان سب کا ممنون ہوں۔ اور اس مضمون کی ترمیم میں ان کی نگارشات سے بہت فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ شیخ اکرام صاحب کا میں خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میری دو ایک تاریخی غلطیوں کی اصلاح فرمائی۔ مولانا صلاح الدین صاحب کا بھی شکریہ

گزار ہوں ، جو محترمہ عطیہ بیگم سے ایک ایسا مضمون حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ، جس کے بغیر یہ موضوع یقیناً تشنہ رہ جاتا ، قوم نظر بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ اس مضمون کی اولین اشاعت میں انہوں نے نہ صرف میری زبان بلکہ شرر اور مہدی حسن کے بعض اقتباسات کی زبان بھی درست فرمائی۔ یہ میری جہالت ہے کہ میں ان اقتباسات کو دوبارہ ان کی اصلی حالت میں شائع کر رہا ہوں۔

وحید قریشی

سوانح نگاری اور علامہ شبلی

شبلی اپنے عہد میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں سے مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے خیال میں ان میں ایک طرح کی خیانت اور خدائی سے کام لیا گیا تھا۔ چنانچہ مہدی حسن موازنہ انیس و دبیر سے ناقل ہیں:

"ہمارے زمانے میں جو سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کے بارے میں یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ابھی قوم کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ تصویر کے دونوں رخ اس کو دکھائے جائیں۔ لیکن عذر پیش کرنے والے خود اپنی نسبت غلطی کرتے ہیں۔ جس چیز نے ان کو اظہار حق سے روکا ہے۔ وہ ایشیائی شخصیت پرستی ہے جس کا اثر قوم کے رگ و پے میں سرایت کرگیا ہے اور عذر کرنے والوں کو خود اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ یہ ایک بہت بڑا ضرر

(نقص) ہے۔"

سید سلیمان ندوی مکاتیب میں لکھتے ہیں:

"انسان کی بڑی سے بڑی سوانح عمری اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصاء کا اہتمام کیا جائے تو سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑ دینے پڑیں گے۔ پچ پچ میں ہفتوں، مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جائیں گے۔"

بعینہ یہی احساس مجھے اس مصنف کی کتاب "حیات شبلی" پڑھ کر ہوا ہے۔ دیکھئے مولانا کی پوزیشن کو کس طرح صاف کرتے ہیں:

"وہ لوگ جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس "دشمن ایمان" کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڑھ میں تھا۔ یعنی کہ وہ علی گڑھ کی تحریک سے الگ ہوکر ندوہ میں شامل ہوگئے۔ یہ غزلیں رسالوں میں چھپیں اور زبان و طرز ادا کی بڑی تعریفیں ہوئیں جو خوش گمان تھے وہ اسے تصوف کے رموز و اسرار سمجھے اور مولانا سے دست بیعت ہوئے۔ اور ان کے پیر کی تلاشیں ہونے لگیں۔ جو بدگمان تھے وہ اس وصف عنوانی کے افراد کی تلاش میں لگ گئے۔ حالانکہ واقعہ نہ یہ تھا نہ وہ۔ بلکہ صرف بمبئی کی خوش سوادی اور حسن نظر نے ان کے شاعرانہ جذبات کو ابھار دیا تھا۔ خطوط شبلی کے اوراق میں یہ سامان نہیں ان کی تاریخ دو برس بعد 1908ء سے شروع ہوتی ہے۔"

ان الفاظ سے خیال ہوتا ہے کہ سید صاحب مولانا کی زندگی کے ان واقعات کی نقاب کشائی بھی کریں گے ' جن کی ابتدا خطوط شبلی سے ہوتی ہے۔ لیکن اس بارے میں سید صاحب بالکل خاموش ہیں۔ میرے خیال میں سلیمان ندوی خطوں کو سند مان کر 1906ء سے 1908ء کے زمانے کو پس پردہ رکھنا چاہتے ہیں جو ایک ادبی خیانت سے کسی طرح کم نہیں۔ مولانا نے اس مسئلے پر خط و کتابت اس وقت شروع کی ' جب انہیں اس کی ضرورت لاحق ہوئی۔ لیکن بر خلاف اس کے انہوں نے شعر صرف اس وقت کہے ' جب "کافروں" کا کرم شامل حال ہوا۔

دراصل شبلی جیسے مذہبی خیالات کے آدمی کا عشق اور پھر وہ بھی بڑھاپے میں۔ تسلیم کی جانے والی بات نہیں۔ شبلی کے طرفداروں کے نزدیک تو ان باتوں کا ذکر ہی لاحاصل ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان چیزوں کا تعلق شبلی کی ادبی زندگی سے مطلق نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف اسی ایک خیال نے شبلی کی شاعرانہ عظمت کو ہماری نظروں سے بہت حد تک اوجھل رکھا ہے۔

سید سلیمان ندوی نے 1917ء میں "مکاتیب شبلی" شائع کی تو حصہ دوم کے دیباچے میں لکھا ہے:

"آخر میں مجھ کو خطوط کے انتخاب میں جو اصول پیش نظر رہا اس کو بھی ظاہر کر دینا چاہئے۔ میں نے صرف ان خطوط کو انتخاب کیا ہے جن سے یا تو مولانا کے ذاتی سوانح کا کوئی واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا ان میں کسی علمی اصلاحی اور قومی مسئلے کا ذکر ہے یا انشا پردازی کا ان میں کوئی نمونہ موجود ہے۔ انہیں اصول ثلاثہ کی رہبری میں ہزاروں خطوط

کے انبار سے یہ چند خطوط چھانٹ کر الگ کیے گئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے بہت سے خطوں کی اشاعت روک دی گئی تھی یاد رہے کہ ان اصول ثلاثہ میں سے پہلا اصول سید صاحب نے محض زیب داستاں کے لیے رکھا ہے۔ کیونکہ جب مہدی حسن صاحب نے لکھا کہ " میرے نام کے خطوط کا کوئی حصہ الگ نہ کیا جائے۔" تو وہ اس کو کسی عنوان نہ ٹال سکے۔ اس سے اس امر کا پتہ بھی چلتا ہے کہ مہدی حسن کو سید صاحب کی افتاد طبع کا حال معلوم تھا۔ صرف یہی نہیں مہدی حسن نے ایک مضمون بھی لکھ بھیجا جسے مرتب کو دیباچے میں جگہ دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے:

" بہر حال خطوں میں (شبلی) نسبتاً کم کھلتے تھے۔ لیکن مجھ پر (مہدی حسن پر) خاص عنایت تھی۔ اس لیے کوئی راز پوشیدہ نہیں رکھتے تھے۔ تاہم تصریحات کی جگہ آپ دیکھیں کہ چشم سخن صرف اشاروں سے کام لیتی ہے۔ میں اس لطف کو کھونا نہیں چاہتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر تصریح طلب نکتوں کی بے نقابی میں نے جائز نہیں رکھی۔"

اس کے ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ :

"مولانا نہایت خوش وضع آدمی تھے۔ اونچے طبقے کی سوسائٹی میں ان کی بہت مانگ رہتی تھی۔ جہاں وہ کسی سے بیگانے نہیں ہوتے تھے۔ ملک کے بعض اونچے خاندانوں سے مخلصانہ روابط تھے۔ ان میں بعض لیڈیاں نہایت شائستہ قابل اور مذاق ادب کی دلدادہ تھیں ان کو بھی خط لکھتے تھے تو

اس طرح جیسے سرکاری گزٹ ! بہت ہوا دعائیں لکھ دیں۔
ایک کو لکھا کہ کچھ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا کی
مقصود بالذات تو وہی تھی۔ یہاں بھی امتیاز رہا۔ سن کر
پھڑک گئے اور میرے انتقال ذہن پر خوش ہوئے۔"

جب یہ بیانات چھپے ہونگے تو ملک میں شبلی کے دشمنوں نے بہت سی افواہیں پھیلانا شروع کی ہوں گی۔ اس لیے کہ جب مہدی حسن نے 1918ء میں شبلی سوسائٹی کی تجویز پیش کی اور ایک طویل مضمون لکھا تو اپنی طرف سے ان الفاظ میں صفائی پیش کی:

"بمبئی کی نازک خیالیاں گویا میرؔ کی جوانی کے قصے ہیں جو
مولانا کی زبان سے ادا ہوئے۔ آپ داد دیں نہ دیں ' شاعر
کو اس کا بالکل احساس نہیں۔ اس کا عالم خیال خود ایک دنیا
ہے۔ ذرا جذبات کا تموج دیکھئے گا۔ سمندر کے کف سے
پری نکلی ،لیکن بالکل عریاں۔ جس کے بالوں سے قطرات
آب موتی کی طرح ٹپک رہے ہیں۔ اس کے نازک ہاتھ
میں ایک ساغر شراب ہے۔ وہ شاعر کی طرف بڑھتی ہے۔
عنبر بکھیرتی ہوئی ' یاقوتی ہونٹوں پر ایک معنی خیز تبسم
ہے۔نازک خیالی جس کی بلائیں لے رہی ہے۔"

دیکھئے کس صفائی سے سارے الزام کو اپنے سر لیا ہے یوں تو مہدی حسن کے ان متضاد بیانات ہی سے ساری حقیقت واضح ہوجاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اس سلسلے میں شبلی کا 15 جون 1909ء کا خط بنام ابوالکلام آزاد پیش کرتے ہیں:

" افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ

کر حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ
ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے ،لیکن عالم
السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوا لیجئے۔
بتا تو نہ دو گے؟"

سلطان حیدر جوش اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ کی کھلی اور ڈھکی
ہر طرح کی زندگی سے مولانا ابوالکلام آزاد خوب واقف
تھے۔ اس تحریر کے آخری جملے میں ایک دفتر پنہاں نظر آتا
ہے۔"

مزید تسلی کی ضرورت ہو تو ظفر الملک علوی (مرحوم) کا بیان ملاحظہ ہو۔ الناظر کے اس مدیر نے جب 1910ء میں شبلی کی ایک نظم چھاپنے کی اجازت چاہی ،تو مولانا نے جو جواب 'انہیں دیا 'وہ انہیں کی زبانی سنئے۔ کہتے ہیں:

" ایک مرتبہ راقم الحروف کو ایک قلمی بیاض سے مولانا
شبلی کے کچھ اشعار کی نقل مل گئی۔ لیکن جب مولانا سے
ذکر آیا اور الناظر میں ان کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تو
انہوں نے بہ اصرار اس سے باز رکھا۔ بلکہ یہاں تک کہا
کہ اگر ان کی اشاعت کی جائے گی تو راقم الحروف سے تمام
تعلقات منقطع ہوجائیں گے۔ یہ اشعار اتفاق سے تلف
ہوگئے ورنہ اب ان کی اشاعت کا اچھا موقع تھا۔ ایک شعر
جو رہ گیا ہے وہ متفرقات میں ملے گا۔"

متفرقات میں یہ شعر ہے:

لغزہ آور تھی نگاہ چشم ساقی اس قدر
خود خود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا

اور نیچے فٹ نوٹ لکھا ہے "جن گم شدہ اشعار کا ذکر گزارش میں ہے ان میں یہ ایک شعر یاد رہ گیا ہے اور درج کر دیا گیا ہے۔" خوش قسمتی سے یہ پوری نظم خطوط شبلی میں ص 83 پر موجود ہے۔ مولوی احمد مکی صاحب لکھتے ہیں:

" شبلی نعمانی کی حیات معاشقہ کوئی راز کی بات نہیں رہی ہے کج سے تقریباً بارہ سال پہلے میرے استاد مولوی محمد مہدی صاحب مرحوم مجھے تمام تفصیلات سنا چکے تھے۔"

مولانا حسرت موہانی کو بھی شک ہوا تھا۔ چنانچہ قاضی احمد میاں جوناگڑھی حسرت سے ناقل ہیں:

" علامہ شبلی انکار کئے جائیں لیکن ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شیوہ دلپذیر کو وہ "تہمت دوستان" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعرانہ طبیعت بہرہ وافر رکھتی ہے۔ اگر ثبوت کی ضرورت ہو تو مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

گر دم از مدحت شیراز و اصفہاں زدہ ام
شرم بادم کہ نواہائی پریشاں زدہ ام

(ترجمہ): اگر میں نے شیراز و اصفہان کی تعریف میں کچھ کہا ہے وہ میری ذہنی بے راہ روی ہے، میں خود اس پر شرمندہ ہوں۔

بمبئی بود مرا منزل مقصود عبث
پیش ازیں گام طلب در رہ حرماں زدہ ام

(ترجمہ): میری منزل مقصود بمبئی تھا، اس سے پہلے میں فضول غلط راہوں پر بھٹکتا رہا۔

اند کی نیز بہ کام دل خود نین باشم
روزگاری چودم از دانش و عرفاں زدہ ام

(ترجمہ): وہ جو چند دن میں علم و دانش کی باتیں کرتا رہا وہ میرے مغرور دل کا ایک فریب تھا۔

چند در پردہ توان کرد سخن فاش بگو
سنگ بر شیشہء تقوی زدہ ام ہاں زدہ ام

(ترجمہ): کب تک اشاروں کنایوں میں بات کرو گے صاف کہہ دو: میں نے زہد و تقوی کا نمائشی لبادہ اتار پھینکا ہے۔

جامہ زہد چو بر قامت من راست نبود
شیشہء تقوی سی سالہ بہ سنداں زدہ ام

(ترجمہ): وہ نمائشی دینداری کا لباس میرے جسم کے مطابق نہ تھا۔ میرا آئینہ مجھے فریب دے رہا تھا۔ اس لیے میں نے وہ آئینہ ہی چکنا چور کر دیا جو تیس سال سے مجھے دھوکا دے رہا تھا۔

آن شدای دوست کہ آراستی پیکر فن
نقش زیبا صنمی بر ورق جاں زدہ ام

(ترجمہ): وہ زمانہ بیت گیا جب میں علم و دانش کے فن پاروں کی نمائش کیا کرتا تھا اب میں نے ایک پیکر جمال کی تصویر اپنے دل کے چوکھٹے میں سجالی ہے۔

آن شد اے دوست کہ درندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آن دشمن ایماں زدہ ام

(ترجمہ): اب میں تمہیں "ندوہ" کی محفلوں میں بھی کبھی نظر نہ آؤں گا کیونکہ

میں نے ایک دشمن ایمان کی محفل میں پہنچنے کا ارادہ کرلیا ہے۔

ہان و ہان دست بدارید زمن ای احباب
کہ بہ زیبا صنمی دست بہ پیماں زدہ ام

ترجمہ: دوستو! اب مجھ سے ملاقات کی امید چھوڑ دو میں نے ایک خوبصورت محبوب سے پیمانِ وفا باندھ لیا ہے۔

پی تواں برد کہ ایں زمزمہ بی چیزی نیست
شبلی ایں تازہ نواھا نہ چومستاں زدہ ام

ترجمہ: غور کرو یہ باتیں بے وجہ نہیں ہیں۔ شبلی نے جو کچھ کہا ہے عالم ہوش میں کہا ہے دیوانگی میں نہیں۔

شبلی ایک جگہ کہتے ہیں:

شبے نیامدم در کوچہء عشق ولی
دوستان تہمت ایں شیوہ بہ ما نیز کنند

ترجمہ: ہم نے کسی رات بھی عشق کے کوچہ میں قدم نہیں رکھا۔ ہمارے دوست ہیں کہ خوامخواہ ہم پر یہ تہمت لگا رہے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ہر چند غلط نیست کہ شبلی دل ودین باخت
ایں حرف ولی مصلحت آمیز نبوداست

ترجمہ: یہ بات کچھ غلط بھی نہیں کہ شبلی ایک محبوب کے قدموں پر دل و دین نچھاور کر بیٹھا ہے۔ لیکن اس کا برملا اظہار مصلحت کے خلاف ہے۔

شبلی اگر اپنا راز چھپاتے ہیں تو مصلحت کی بنا پر۔ وہ عوام سے ڈرتے تھے۔ اس لیے اول تو اردو میں عشقیہ شعر کہنے سے پرہیز کیا جو ایک آدھ نظم کہی اسے چھپنے نہ دیا۔ فارسی میں انہوں نے حال دل کہہ ڈالا کہ خواص تک

محدود تھی۔

اب ذرا مولانا کے اس سوانح نگار ("حیات شبلی" بشیر پاشا سیریز) کا بیان ملاحظہ ہو 'جو جا بجا مولانا کی طرف داری کا دم بھرتا ہے:

"مولانا نے ایک خاتون کی تربیت کرنا چاہی تھی اور ان کی تمنا تھی کہ یہ خاتون بہت بڑی مقرر اور لیکچرار بن جائے ' لیکن مولانا کی نظر محبت نے غور سے مطالعہ نہ کرنے دیا۔ ورنہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ جس منصہ کمال پر وہ اسے لانا چاہتے ہیں۔ اس کے برخلاف اس کا میدان طبع دوسرے اسٹیج کی طرف ہے:

جاں کشاید سوئے بالا بالہا
در زدہ تن درزمین چنگالہا

ترجمہ: طائر خیال بلندیوں پر پرواز کرنا چاہتا ہے مگر مادی جسم زمین سے چمٹا ہوا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا فاضل سوانح نگار کا اشارہ دوسرے اسٹیج سے کس بات کی طرف ہے 'اور وہ اس موقع پر کیا کہنا چاہتے ہیں۔ تاہم قارئین سوچیں کیا اس سے کوئی بات نکلتی ہے؟ شائد اقبال کے خطوط بنام عطیہ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں!

حالات زندگی

شبلی کے عشق کو ہم ایک اتفاقی حادثہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے کہ اس قسم کے حالات پیدا ہوگئے تھے، جو اس امر کے مقتضی تھے کہ شبلی کو ایک فرار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انسانی مزاج کے بنانے اور ڈھالنے میں ماحول کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شبلی کی شخصیت کن ادوار سے گزری۔ انہوں نے ہر دور سے کیا اثر قبول کیا اور بمبئی پہنچتے پہنچتے ان کی طبیعت نے کون سا رنگ اختیار کیا۔ اس کے لیے ہمیں ان کی تمام گزشتہ زندگی کو دیکھنا ہوگا۔

علامہ شبلی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ گھر میں ان کی یہ پوزیشن ان کے طرز حیات کی طرف کھلا اشارہ کرتی ہے۔ لیکن ان کی نشوونما ایک سیدھے خط میں نہ ہو سکی۔ اس لیے ان کے (Character Trait) میں

ہمیں ظفرمندی کے وہ آثار نہیں ملتے، جو انہیں امن و اصلاح کا محافظ بنا سکتے۔ ان کی زندگی ایک مستقل جدوجہد رہی جس میں فتحیں کم اور شکستیں زیادہ تھیں۔ اپنی ان شکستوں کا شمار وہ ابتدائے حیات سے کرتے رہے ہیں اس لیے اگر ان کی نرگسیت کو ایک ٹیڑھا خط تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

اپنے چھوٹے بھائی مہدی سے ان کے تعلقات شروع ہی سے کچھ اچھے نہیں رہے۔ اور امتداد زمانہ کے ساتھ نفرت زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔

ان کی تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد باپ کی توجہ انگریزی کی طرف ہوگئی۔ اور ان کے چھوٹے بھائیوں کی تربیت کا طرز انگریزی ہوا۔ اس لئے انہیں اپنے بھائی میں عظمت کے وہ آثار نظر آنے لگے جن میں علامہ کو اپنی شکست نظر آتی تھی۔ مہدی کے ولایت جانے نے تو ان کے "غم و غصہ کو اور گہرا کردیا تھا" 1879ء میں مہدی نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا اور شبلی اس میں بھی فیل ہوگئے۔

واقعات کی ان کڑیوں سے نرگسیت کی اس اعصاب زدہ ہیئت کی بنیاد پڑ گئی جو بعد میں طرح طرح سے ظاہر ہوئی۔ وہ شدید احساسات کے انسان ہوگئے" جس چیز کے حق میں ہوتے اسے آسمان پر پہنچا دیتے اور جس کی مخالفت شروع کرتے بعض اوقات اعتدال اور انصاف سے آنکھیں بند کرلیتے۔"

اس ابتدائی زندگی میں ہمیں ان کے کردار کا ایک اور خط واضح طور پر نظر آتا ہے۔ وہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ ان کے والد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ جس سے وہ اپنی ماں کے طرف دار ہوگئے تھے اور بعض اوقات تو انہیں اپنے والد کے خلاف کچھ کلمات بھی کہنے پڑے۔ ایک عرصے تک (باپ کی وفات تک) باپ بیٹے کے تعلقات کشیدہ رہے۔ "انہیں اپنی ماں سے محبت تھی" ان کی والدہ کی موت سوتیلی ماں کی آمد کے غم سے ہی ہوئی۔ اس لیے شبلی

نے تمام عمر سوتیلی ماں سے بات نہ کی اور باپ سے نفرت کرتے رہے۔

ماں کی محبت ان کے کردار کا ایک خاص پہلو ہے۔ باپ کی مخالفت اور بھائی کی مخالفت انہیں دو انتہاؤں میں علامہ شبلی تمام عمر بھٹکتے رہے۔ تاہم ان کے لیے سب سے اہم خود ان کی ذات ہوگئی۔ شبلی کی نرگسیت اپنے اندر انتہا پسندی اور کنزرونزم کے آثار لیے ہوئے ہے اور اس مرکز سے ان کی زندگی کا ہر گوشہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

"مولانا نے جن درس گاہوں میں تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا ان کی صحبت نے ابتدا ہی میں انہیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انہوں نے اپنے نام کے ساتھ نعمانی لکھنا شروع کردیا۔ جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انہیں اپنی غلط فہمی کی بنا پر نسبا حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کوفی کی نسل میں خیال کرلیا مگر اس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے۔ وہ متشدد حنفی تھے۔ اور حنفیت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ انہوں نے امام صاحب کی سوانح عمری "سیرۃ النعمان" لکھی اور علی العموم محدثین کے اصولوں سے اختلاف کیا کرتے تھے۔"

اس وقت تک " مولانا نے جس فضا میں پرورش پائی تھی اس کا تقاضہ تھا کہ مقلد اور غیر مقلد کی معرکہ آرائی میں مولانا بھی نبرد آزمائی کریں۔ مولانا خود حنفی تھے اور مولانا فاروق چڑیا کوٹی اور مولوی احمد علی کی شاگردی نے انہیں جوشیلا حنفی بنا دیا تھا۔

چنانچہ غیر مقلدیت کی تردید میں مولانا نے خوب زور قابلیت صرف کیا۔ وھابیت کی تردید میں کئی رسالے اردو فارسی اور عربی میں لکھے۔"

"اس زمانے میں مولانا لڑکوں کو پڑھایا بھی کرتے تھے وہ اس وقت تند مزاج مولوی کا مکمل نمونہ تھے۔ تارکین صلوٰۃ پر انتہائی تشدد کرتے۔ بعض

لڑکوں کو دو دو گھنٹے تک اس لیے پیٹا کرتے کہ نماز پڑھنے کا مستحکم وعدہ کریں۔"

ان آخر کے جملوں کو ذرا ذہن میں رکھئے کیونکہ اپنی شخصیت کے منوانے کا جو جذبہ اس کی تہہ میں کام کررہا ہے آگے چل کر مولانا کی زندگی میں مختلف شکلوں میں نمایاں ہوگا۔

اس کے بعد مولانا نے اپنے گاؤں میں زمینداری شروع کردی تھی لیکن یہ درد سر کہاں اور مولانا کی مولویت کہاں۔ اس مشغلے کو ترک کرتے ہی بنی۔ پھر مولانا نے وکالت شروع کی۔ لیکن یہ پیشہ اور اس کی چالیں مولانا کو مناسب نظر نہ آئیں اور محکمہ امانت میں ملازم ہوگئے۔ رمضان کا مہینہ تھا لیکن مولانا دیانتدار اور فرض شناس آدمی تھے اس لیے شدید گرمی میں گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرا کرتے۔ روزہ دار ہونے کے باوجود اپنا فرض منصبی مستعدی سے ادا کرتے تھے۔"

ایک مہینہ جوں توں کرکے بسر ہوا اور آخر کار مولانا نے نوکری چھوڑ مصلے میں پناہ لی۔

جس شدت سے مولانا پر مذہبی رنگ چڑھا تھا اسی شدت سے علی گڑھ آنے کے بعد اس کا ردعمل شروع ہوا۔ سرسید کی تحریک نے ملک میں ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ مولانا بھی اس گروہ میں شامل ہوئے اور خوب داد شجاعت دی۔ کہیں پبلی ریڈنگ کے جلسے میں قصیدہ پڑھا، کہیں مثنوی صبح امید اور سرسید کے قومی تھیٹر کے مسدس کی بنیاد ڈالی۔ (جس کے ساتھ قومی نظمیں پڑھنے کا ایک خاص انداز رائج ہوا)

اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کردینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔ سرسید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث گروہ

میں تھے۔ لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے انہیں بڑی حد تک غیر مقلد سے ایک معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی صحبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہونا 'غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بھڑک تھی۔ اس کی وجہ سے بھی ممکن نہ تھا کہ وہ نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکل آتے۔ لہذا بغیر اس کے کہ غیر مقلدیت کا کچھ رنگ چڑھنے پائے وہ بلاواسطہ نعمانی سے معتزلی ہونے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں۔

علی گڑھ کے طلبا میں شبلی عموماً غیر ہر دل عزیز تھے۔ ان کو طلبا خشک اور مغرور سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ علی گڑھ کے قیام میں ان کی نرگسیت نے بعض اختلافی صورتیں بھی اختیار کیں۔ "سید صاحب کی صحبت علی گڑھ کالج کی مرجعیت اور ان کی ذاتی قابلیت نے انہیں ابتداء اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس (متعارف) کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں۔ خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمرکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور پختگی حاصل ہوگئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خود داری اس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی۔"

چنانچہ بقول مہدی حسن جب انہوں نے "علم الکلام" لکھی تو سرسید کا نام تک نہ لیا۔ حالانکہ "علم الکلام" کے سلسلے میں سرسید نے جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ مہدی حسن کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"یہ بات بھی غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی حد سے بڑھی ہوئی خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف

میں فیاض نہ تھی۔ شبلی نے "الکلام" لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔"

"اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ مٹا نہ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت (یعنی سرسید کی طرفداری) کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کر علی گڑھ کالج سے علیحدگی اختیار کر کے ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعے سے میں علماء کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے تک پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔"

سرسید کی صحبت سے شبلی کے سخت دینی عقائد میں کچھ لچک پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شبلی کی اپنی شخصیت کو بنوانے کی خواہش ایک طرف تھی اور سرسید کی انگریزی تعلیم کا اثر دوسری طرف۔ ایک طرف وہ پرانی تعلیم کے حق میں تھے اور دوسری طرف قدیم تعلیم کی ابتری سے بیزار بھی تھے۔ چنانچہ ندوۃ العلما میں انہوں نے جو تحریک چلانی چاہی وہ یہ تھی کہ "عربی کی مکمل تعلیم اور انگریزی بقدر ضرورت۔"

ایک طرف مولانا روشن خیال تھے تو دوسری طرف سرسید کے برابر پوزیشن حاصل کرنے کا خیال۔ ایک طرف حصول جاہ کی خواہش نے ندوہ کے بکھیڑوں میں ڈال دیا اور دوسری طرف آزاد خیالی نے اور ہی گل کھلائے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ شبلی میں کوئی تضاد یا ثنویت تھی 'کیونکہ ان کی نرگسیت ان کے دنیوی مشاغل 'علمی مشاغل' شاعری اور عورتوں کے عشق' لڑکوں کے عشق سب میں کارفرما نظر آتی ہے 'اور کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ سب کا عمل ایک ہی ذہنی افق کا کرشمہ ہے۔

اس وقت علامہ کا رجحان یہ تھا کہ وہ سرسید کے برابر نام پیدا کرنا

چاہتے تھے۔ دوسرے وہ اس تعلق سے بھی خود کو الگ ظاہر کرنا چاہتے تھے ،جو انہیں سرسید سے تھا ،اور جس کی بدولت وہ ادبی اور سیاسی محفلوں میں متعارف ہوئے تھے۔ تیسرے ان کی طبیعت جس پر ان کی تعلیمی دلچسپیوں کا اثر تھا اپنے نظام میں دینی رجحانات کو زیادہ نمایاں جگہ دینا چاہتے تھے۔ اس کی ایک صورت یہی ہوسکتی تھی کہ وہ اس گروہ کی حمایت حاصل کریں ،جو مشرق وسطی کی سیاسی تبدیلیوں کے زیراثر عام مسلم بیداری کی شکل میں ابھر رہا تھا۔ یہ ان کے مشاغل کا ایک دائرہ تھا جس میں وہ اعلیٰ مقام اور لیڈری حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ دوسری طرف ان کی نرگسیت جس سے تنگ نظری کا خلاف سرسید کے زیر اثر رہ کر اتر چکا تھا حسن و عشق کی رنگینیوں میں راستہ تلاش کررہی تھی۔ اس رجحان کے ابتدائی آثار قیام حیدر آباد اور اس کے بعد اعظم گڑھ میں ظاہر ہوتے نظر آتے ہیں۔ جس کے تین مرکز تھے ایک ابوالکلام کی ذات دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے مدراس کی کوئی ہستی (اس کی تفصیلات ابھی منظر عام پر نہیں آسکیں) البتہ ان دو طرح کے عشقوں کی نوعیت میں اتنا فرق ضرور ہے کہ لیڈرانہ پوزیشن اور قومی و ملی کاموں میں دلچسپی کی تہہ میں پوشیدہ اہم عنصر حصول جاہ کی خواہش ہے ،اور افراد کی محبت میں خاص پہلو جنسی ہے اگرچہ دونوں کا محرک قوی ان کی اپنی ذات ہے۔

جب مولانا حیدر آباد گئے تو یہ زنجیریں (دینی عقائد کی) اور ڈھیلی ہوگئیں۔ اب وہ داغ وغیرہ کی صحبت میں غزل سرائی کرتے۔ گاہے گاہے بمبئی بھی جاتے ، لیکن اسی زمانے کے مشاغل رنگین کسی صراحت سے صفحہ قرطاس پر ثبت نہیں ہوئے۔ اس لیے ان کی نسبت جو کچھ لکھا جائے گا وہ قیاس آرائی سے زیادہ نہیں۔ بعض خطوط میں مبہم اشارات ہیں جو خدا معلوم کس بات کی نسبت ہیں۔ ایک خط میں نواب حبیب الرحمان شروانی کو جو ان

کے محرم راز اور دوست تھے ،لکھتے ہیں:

"مدراس ضرور تشریف لائیے مجاز قنطرۃ الحقیقت ہے"

اس کے کوئی تین چار ہفتے بعد جب مولانا شروانی مدراس ہوکر واپس گئے اور وہاں سے شاید ان مشاغل مدراس کی نسبت کچھ لکھا تو شبلی جواب میں کہتے ہیں:

"میں نے مدراس میں نئی وادی میں قدم نہیں رکھا۔ بلکہ یہ پرانا کوچہ تھا جس کی مدتوں خاک چھانی ہے

ع ماہم ازمستان این می بودہ ایم (ہم بھی اس کے گلی کوچوں کی خاک چھانتے رہے ہیں)۔ زمانہ کے ہاتھوں دوسروں کے لیے اپنی جگہ خالی کرنی پڑی تھی:

"ازھماں بزم کہ جزمن دگری راہ نداشت
بایدم رفت کہ بر دگراں جا باشد"

ترجمہ: اس محفل میں ہمیں جو مقام حاصل رہا ہے حالات کا تقاضا ہے اب ہم وہ مقام دوسروں کے لیے خالی کردیں۔

ہوسکتا ہے اس کا اشارہ انہیں خاتون کی طرف ہو جن سے مولانا 1900ء کے قریب اپنی پہلی بیوی کی وفات پر شادی کے خواہاں تھے۔ اور جس کی تفصیل امین زبیری صاحب نے یوں بیان کی ہے:

"بیوی کے انتقال کے بعد انہی جکڑ بندیوں کے خوف سے انہوں نے عقد ثانی نہیں کیا اور جب بزرگوں اور دوستوں کے مجبور کرنے پر راضی ہوئے تو خاندان کی قید کو توڑ کر مولانا محمد علی مرحوم ناظم ندوہ نے اپنے ایک ہم سبق دوست کی لڑکی تجویز کی ،جس کو خدا نے صوری و معنوی

خوبیاں عطا کی تھیں اور جس نے فارسی کی اچھی تعلیم
حاصل کی تھی۔ لیکن مولانا ہی کے احباب میں ایک ذی
ثروت و مرتبت دوست اس جنس نفیس کے خریدار بن گئے"

بہر حال روئے سخن جس طرف بھی ہو مولانا کی دوسری شادی 1900ء ہی میں ایک خاتون سے ہوگئی جو انہی خاتون کی طرح عمر میں مولانا سے بہت چھوٹی تھیں۔ اتنی چھوٹی کہ مولانا اس بات پر راضی تھے کہ شادی کے بعد کچھ وقت مجردی میں گزار دیں۔

معلوم نہیں انہوں نے شادی کے بعد کا زمانہ مجردی میں گزارا یا نہیں، یا اپنے ڈاکٹر مصطفیٰ خان صاحب کے مشورے پر عمل کیا ہو۔ تاہم یہ خاتون 1905ء میں چل بسیں اور مولانا پھر خالی رہ گئے۔

اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور عطیہ بیگم سے بیک وقت محبت کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی تفصیل اگلے صفحوں میں آئے گی، فی الحال اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ مولانا کا مزاج ان دنوں بڑا رومانی تھا۔ ندوے کے چندے کی خاطر اور بعض دوسرے کاموں کے لیے مولانا کو بمبئی بھی جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان کے کلیات سے پتہ چلتا ہے کہ ستمبر 1906ء کو وہ بمبئی میں تھے۔ اب حد سے بڑھے ہوئے مذہبی شغف کے بادل چھٹ چکے تھے اور مولانا بمبئی اور اس کے کاروان ہائے عشق کو آنکھیں کھول کر دیکھ سکتے تھے۔ بمبئی اور اس کی رونقیں اکثر مولانا کو گرمیوں میں وہاں کھینچ کر لے جاتیں۔ " چنانچہ 1906ء سے لے کر 1908ء تک مولانا نے جو غزلیں کہیں ان کا محرک یہی شہر بمبئی کا قیام تھا۔ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور دلکش نظارے دل آویز تفریح گاہیں۔ اور اس سے بڑھ کر وہاں کی رنگین اور دلچسپ صحبتیں یہ سب محرکات ایسے تھے جنہوں نے ان کی شاعری کے سمندناز پر تازیانے کا کام کیا۔ ان کے

تغزل کا دور صحیح معنوں میں اس بلدہ حسن و موسیقی اور اسی دیار حسین و رنگین سے شروع ہوتا ہے۔" چنانچہ ستمبر 1906ء کے تاثرات ملاحظہ ہوں:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا
طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را

ترجمہ: اپنی موجودہ اور سابقہ کل دولت بمبئی کے خوش نما منظر پر نثار کردے یہاں وہ حسین مناظر ہیں جن پر جمشید کا تاج و تخت اور خسرو کی شان و شوکت بھی قربان کی جاسکتی ہے۔

بہر سواز ہجوم دلبران شوخ و لی پروا
گزشتن ازسرہ مشکل افتاد است رھرورا

ترجمہ: شاہراہوں پر حسینوں کے ہجوم کی وجہ سے مسافروں کے لیے راہ چلنا مشکل ہے۔

فغان از گرمی ہنگامہء خوبان زر دشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضورا

ترجمہ: ان آتش پرستوں (حسینوں) سے خدا اپنی پناہ میں رکھے انہوں نے زلف و رخسار کی آمیزش سے روشنی اور تاریکی کو یکجا کردیا ہے۔

بدہ ساقی می باقی کہ درجنت نخواہی یافت
کنار آب چوپاٹی و گل گشت اپاورا

ترجمہ: ساقی! تیری صراحی میں جو شراب باقی رہ گئی ہے وہ بھی ہمیں یہیں پلادے کیونکہ چوپاٹی اور اپالو جیسے حسین مناظر شاید جنت میں بھی نصیب نہ ہوں۔

شبلی کا یہ عشق جہاں تک اندازہ ان کے کلام سے ہوتا ہے اس کی نوعیت کم و بیش جنسی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی احمد میاں جونا گڑھی کو کہنا

پڑا کہ ان کی غزلیں گرما گرم ہیں اور حالی یوں گویا ہوئے:

"کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان 'الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں۔ غزلیں کاہے کو ہیں شراب دوآتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ رندی اور بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے یہ غزلیں بہت زیادہ گرم ہیں۔"

چنانچہ ستمبر 1906ء میں لکھے ہوئے اشعار ملاحظہ ہوں۔

مست و پر عربدہ کشش بکشم در آغوش
تشنہ وصلم و تاکی بہ محابا باشم

ترجمہ: میں کب تک مستی و دیوانگی میں اسے اپنی آغوش میں کھینچ لوں۔ میں وصل کا پیاسا ہوں کب تک صبر کرتا رہوں۔

من فدای ہمت شوخی کہ بہ ہنگام وصال
ہمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را

ترجمہ: قربان جائے اس محبوب کی اس مہربانی پر 'اس نے خود ایک دفعہ وصال کے موقع پر مجھے ہم آغوشی کا طریقہ سکھایا تھا۔

گویا دشمنم از ذوقش نصیبی بردہ است
بادہ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود

ترجمہ: ہمیں جو مئے وصل نصیب ہوئی اس میں وہ کیف و سرور نہ تھا جو ہونا چاہئے۔ معلوم ہوتا ہے میرا کوئی دشمن اسے جھوٹا کر گیا ہے۔

گرچہ من مرد ہوسناکی و رندی نیستم
ایں چنیں ہم گاہ گاہم اتفاق افتادہ بود

ترجمہ: میں کوئی لوباش و ہوس پرست انسان نہیں ہوں 'ایسے مواقع مجھے کبھی کبھی نصیب ہوتے ہیں۔

خیال بوسہ آن لعل نوشیں دوش می بستم
ہنوزم لب ز ذوق آن شکرباد است پنداری

ترجمہ: میں گزشتہ شب اس لب لعلیں کے بوسہ کا تصور کر رہا تھا اس کے اثر سے اب تک میرے ہونٹوں پر مٹھاس کا اثر ہے۔

اور پھر 17 اپریل 1907ء کو الہ آباد میں بیٹھے ہوئے تو ان کے ذہن نے کمال ہی کر دیا ہے:

شب وصل است حیا گر بجزاری چہ شود
یک دم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

ترجمہ: شب وصال ہے یہ شرم کا پردہ اٹھ جائے تو بہتر ہے۔ اگر خود بڑھ کر مجھ سے ہم آغوش ہو جاؤ تو لطف دوبالا ہو جائے۔

تو بدین حسن، تونگر چہ زیاں برداری
این دو بوسہ تو اگر خود نشماری چہ شود

ترجمہ: تجھے خدا نے حسن کی دولت سے نوازا ہے۔ آج ایک دو بوسے شمار نہ کرو گے تو اس میں کیا کمی آجائے گی۔

از تو ناید گرہ بند قبا وا کردن
اگر این عقدہ ہمن باز سپاری چہ شود

ترجمہ: تمہیں شاید ابھی بند قبا کھولنا نہیں آتا 'مجھے کہو تو میں یہ مشکل حل کر دوں۔

یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اگرچہ مولانا کا عشق اول اول حجاب میں تھا مگر اس کا جنسی پہلو روز اول سے ہی نمایاں تھا۔ ہم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ اشعار سوچ چار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ہیں اور ان کے تخیل کی بے باکی پر دال۔ ورنہ وہ تو خود کہتے ہیں:

غمگین مباش گر سخن از مدعا نرفت
شبلی ھنوز اول راز و نیاز بود

ترجمہ: شبلی رنجیدہ و فکرمند نہ ہو اگر اصل مقصد پر گفتگو نہ ہو سکی یہ راز و نیاز کی سلسلہ جنبانی کا پہلا موقع تھا۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اپنی عمر کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا راز عشق افشا کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی:

محتسب دست بدامان من و من سرمست
دست در دامن آن شوخ خوؤ آرا باشم

ترجمہ: محتسب میرا دامن پکڑ کر گھسیٹ رہا ہے اور میں عالم مدہوشی میں اس شوخ (محبوب) کے دامن سے چمٹا ہوا ہوں۔

دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی
دامن بمبئی از کف نہ دہم تا باشم

ترجمہ: شبلی! میں بمبئی سے باہر نہیں جاؤں گا کیونکہ یہاں مجھے عیش و نشاط کے مواقع حاصل ہیں۔

بلکہ اپنے عشق کی ابتدائی منزلیں کامیابی سے طے کرنے پر بھی ان کو "تسلی نمی شوم" کا گلہ رہا۔

دریافتیم مستی ذوق وصال را
ایں نشہ ہم زحوصلہ ما زیاد نیست

ترجمہ: ہم نے ذوق وصال کی مستی بھی دیکھ لی 'وہ بھی ہمارے حوصلے سے کم ہی رہی۔ (اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن۔)

جب تک یہ سلسلہ قائم رہا ان کے اشعار میں مستی اور والہانہ پن موجود رہا۔ جب تک بمبئی اور اس کے قرب و جوار میں رہتے 'عمدہ شعر نکالتے 'لیکن جب لکھنؤ جاتے تو کچھ نہ کہہ سکتے۔

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی
حالیا شبلی شدم رند غزلخوان نیستم

ترجمہ: بمبئی کی فضا سے باہر کوئی میرے اشعار میں رنگینی تلاش نہ کرے 'یہاں بھی ابھی میں شبلی ہی ہوں رند غزل خواں نہیں بنا ہوں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کا عشق کامیاب ہو چکا تھا۔ بمبئی آتے تو مس عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا لیکن سرسید بننے کی خواہش انہیں کب دم لینے دیتی تھی۔ ندوہ کے خشک کاموں میں الجھتے اور بری طرح الجھتے۔ اور ایسے وقت میں شعر کیا خاک ہوتے۔ 26 نومبر 1908ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"بمبئی کا مہمان آج کل حسن اتفاق سے یہاں ہے۔ یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جز کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی سے ندوے کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر ابتر کر دیا ہے کہ ایسے مواقع سے بھی فائدہ (معلوم نہیں مرحوم کی فائدہ سے کیا مراد تھی؟) نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس

نے بڑھ کر منظر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ افسوس غیرت اور محبت کی کش مکش تھی ورنہ آپ بھی دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔"

ایک خط میں 18 فروری 1908ء کو مولانا حبیب الرحمان شروانی کو لکھتے ہیں:

"عین اس وقت کہ چمن زار بمبئی کی گلگشت نے عالم طلسم میں پہنچا دیا تھا۔ بہاول پور کے عہدے داروں کا خط پہنچا کہ ریاست کے حکم سے ندوہ کے معائنہ کو آتے ہیں۔ اس وقت تمہارا ہونا ضروری ہے۔ بالکل ایسی حالت میں بمبئی سے نکلا جس طرح مرحوم شدّاد نے عدن کو خیر باد کہا تھا۔"

اس کے بعد پھر 26 فروری کو لکھتے ہیں:

"اب کے بمبئی میں عجیب صحبتیں رہیں لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا۔ لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خواہش کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں۔ اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔"

مولانا کی دوہری محبت بڑی مرکب سی ہے۔ ندوہ کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد میں دلچسپی اور پھر عطیہ بیگم کے ساتھ لگاؤ۔ آزاد کی محبت اور اس کے ساتھ ہی عطیہ بیگم سے محبت۔ عطیہ کے عشق کی تفصیل بھی دلچسپ ہے اگر ایک طرف انہیں ندوہ عزیز ہے تو دوسری طرف عطیہ لیکن آپ دونوں کو ساتھ ساتھ چلانا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ان کے اشعار سے

جنسیت کی بو آتی ہے تو دوسری طرف وہ عطیہ کے ساتھ جانماز کا تعلق پیدا کرنے کے خواہشمند ہیں۔ کبھی اسے دینی باتوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ کبھی حج کی تلقین کرتے ہیں۔ بظاہر اس تضاد کو اگر اب اس زاویہ سے دیکھیں جس کا اظہار کیا جاچکا ہے تو شبلی کی شخصیت میں ہمیں کوئی تضاد کوئی ثنویت نظر نہیں آتی۔ ان کی نرگسیت ایک لڑکے میں اپنا بدل تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ایک مردانہ صفات کی عورت ان کی محبت اور شاعری کا موضوع بنتی ہے۔ یہی ان کی روداد محبت ہے اور یہی ان کی نرگسیت کا سیل رواں جو بیک وقت ندوے کے ریگزاروں میں بھی بہتا ہے اور عطیہ کے دوپٹے اور ابوالکلام کی دستار کو ایک ہی لڑی میں پروتا جاتا ہے۔ ابوالکلام آزاد "تذکرے" میں لکھتے ہیں:

"گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا خانہء اعمال خالی رہا ہو۔ اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے۔

چوں پرسش گنہم روز حشر خواہد شد
تمسکاتِ گناہانِ خلق پارہ کنند

ترجمہ: حشر کے دن جب میرے گناہوں کا حساب ہوگا، دوسرے لوگوں کے بڑے بڑے گناہوں کی فہرستیں پھاڑ کر پھینک دی جائیں گی۔

"قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ ہم خود اپنے آپ ہی شاہد بن جائیں....."

ابوالکلام کا یہ اقرار جائے خود ان کی سربلندی کا باعث ہے۔ لیکن جانے وہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت اپنے افعال کو "فسق و فجور" مانتے

ہوئے انہیں مجاز سے حقیقت کا راستہ کیوں بتاتے ہیں۔ دیکھئے صفحہ 309 پر لکھتے ہیں:

"ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اول روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو۔ تو ہم کو اپنی رندی و ہوسناکی کی تردامنی کا کوئی شکوہ نہیں۔ جس کو عین اکیس بائیس برس کی عمر میں (کہ جنون شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح لوٹا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑ گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا۔ کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں، امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے جب کہیں جاکر اس کوچے میں دم لے سکے جہاں آج اپنے کو پا رہے ہیں:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اس سے تین نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ فسق و فجور کا زمانہ اکیس بائیس سال کی عمر سے ہے۔ ابوالکلام آزاد 1888ء میں پیدا ہوئے اس لیے اندازا یہ دور 1909ء یا 1910ء کے قریب ہونا چاہئے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے آخری اور قطعی تاریخ سمجھ لیا جائے۔ مولانا شبلی سے (ابوالکلام آزاد کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ 14 سال کی عمر میں ان کی خط و کتابت شبلی سے ہوئی اور پہلی ملاقات بمبئی میں 1904ء میں ہوئی) ان کی خط و کتابت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب آزاد کی عمر 17 سال کی تھی۔ 1909ء تک کے اس خلا کے بارے میں شیخ اکرام لکھتے ہیں:

"اس کے بعد ساڑھے تین سال کا وقفہ ہے پتہ نہیں

اس دوران کے خطوط محفوظ نہیں رہے یا کسی مصلحت کی بنا پر ان کی اشاعت روک دی گئی۔"

سید سلیمان ندوی کی مصلحتوں کا ذکر اس مضمون کے شروع میں ہو چکا ہے۔ شیخ اکرام مرنجان مرنج آدمی ہیں اس لیے اصل بات دبے لفظوں میں کہہ گئے ہیں۔ اس کی تائید اس تیسرے خط سے ہوتی ہے جس کا حوالہ خود صاحب شبلی نامہ نے دیا ہے۔

ازاں بہ دردِ دگر ہر زمان گرفتارم
کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

ترجمہ: میں ہر وقت اس فکر میں سرگرداں رہتا ہوں کہ تیری شوخی و ادا میں باہم آشنائی کیوں نہیں۔

بھائی! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کردی کہ الیاس احدی الراحتین (ناامیدی بھی ایک طرح سے سکون ہی ہے) لیکن تم زہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی پہ بھی منظور!! کلکتہ گیا۔ ایک خاص کام تھا..... دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں۔ لیکن ع

"چہ خط خضر بردہ از عمر جاودان تھا"

ترجمہ: خضر تھا رہ کر اپنی دائمی زندگی سے کس طرح لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

دوسرا نتیجہ تذکرہ کے محولا بالا ٹکڑے کے آخری شعر سے ہوتا ہے جس سے صاحب تذکرہ اور شبلی کے تعلقات کی صحیح نوعیت پر روشنی پڑتی ہے۔ تیسرا نتیجہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اپنے افعال کی مجاز و حقیقت والی توجیہات کے قائل ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا شبلی نے ابوالکلام میں اپنی ذات کا عکس دیکھا تھا۔ یہی وہ نرگسی الجھاؤ ہے جسے ممتاز حسن صاحب نے "غبار خاطر" پر

تبصرہ کرتے ہوئے ابوالکلام میں دکھایا ہے۔ عقلی طور پر آزاد اس رودادِ محبت کو فسق و فجور مانتے ہیں ' لیکن اسی اہانت کو چھپانے کے لیے جو اسی انداز کا لازمی نتیجہ ہے جس کی طرف شعر نے اشارہ کیا تھا وہ اپنے مادی عشق کو بیک وقت فسق و فجور اور مجاز سے حقیقت کا راستہ بتا کر بری الزمہ ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس موقعہ پر یہ نہ بھولنا چاہئے کہ مولانا شبلی کی دوسری بیوی کی وفات 1905ء کے قریب ہوگئی تھی۔ تاہم کیا ہم جنس اور شہوانیت کو ہم معنی سمجھ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہرگز نہیں۔ مولانا کی محبت جنس ہے شہوانیت نہیں۔ پھر آخر کیا مولانا ابوالکلام آزاد دور دور کی محبت کو فسق و فجور کہتے ہیں؟ ہوسکتا ہے ایک سخت مزاج مولوی کا انداز نظر اس بارے میں یہی ہو۔ یہ تو خدا کے بعد ابوالکلام آزاد ہی جانیں کیونکہ وہ بقول شبلی " عالم السرائر" ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر میں یہیں چھوڑتا ہوں اور ان کے 1909ء اور بعد کے خطوط کا ذکر ندوہ کے جھگڑوں اور عطیہ کے اسی دوران کے خطوط کے ساتھ کروں گا۔

بے موقعہ نہ ہوگا اگر میں اس جگہ یہ عرض کردوں کہ علامہ شبلی کے اشعار کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک الجھن سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اشعار کی جنسی نوعیت کے علاوہ ان کے ہاں بار بار شراب اور ساغر کا ذکر آتا ہے۔ شراب محض مل بیٹھنے اور باتیں کرنے تک محدود تھی۔ لیکن ساغر زون کہیں کہیں دو قدم آگے چلتا نظر آتا ہے۔شراب کے بارے میں مہدی حسن لکھتے ہیں:

"شراب منہ سے نہ لگی تھی 'صرف زبان پر چڑھی تھی لیکن انہوں

نے چھلکتا ہوا جام دفعتاً خالی کردیا:

"چھلکائیں پھر کے لاؤ گلابی شراب کی
تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی"

اور خود شبلی بھی تو کہتے ہیں:

شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو درگماں کہ مستی او ازشراب بود

ترجمہ: شبلی اس کی مست آنکھوں کے اثر سے مست ہے۔ تو نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ وہ شراب کے نشہ میں ڈوبا ہوا ہے۔

1906ء سے 1912ء

سلطان حیدر جوش کے خیال میں شبلی کی حیات معاشقہ کی ابتداء حادثہ گزندپا کے بعد ہوئی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

"زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بمبئی والا قلبی ہیجان مولانا کے تیمور بن جانے کے بعد رونما ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے دماغی ہیجان کا مرکز سرسید کی صحبت تھی تو بمبئی کے قلبی ہیجان کی جان مس عطیہ فیضی کی ذات۔ اس لذت والے درد یا درد والی لذت کی اچھی خاصی جھلک ایم مہدی حسن کے چند خطوں میں نظر آتی ہے۔ مگر

خطوط شبلی کی چھوٹی سی آرسی تو اس معاملے میں آئینہ خانہ ہے۔"

ہمارے نزدیک جوش صاحب کا یہ بیان کسی غلط فہمی کی بنا پر ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے شبلی کی افتاد طبع کا اندازہ صرف ان کے خطوط سے لگایا ہے۔ اگر وہ اس سلسلے میں شبلی کی شخصیت پر بھی نظر رکھتے تو شاید ان کی رائے کچھ مختلف ہوتی کیونکہ ستمبر 1902ء میں لکھے گئے اشعار جس بات کی غمازی کرتے ہیں اس کو حادثہ گزندپا (جو 1907ء میں ہوا) کے بعد کی بات بتانا صحیح نہیں۔ مثلاً اس زمانے کی دو تین غزلوں کے مندرجہ ذیل اشعار پر توجہ فرمائیں:

چند بے ہودہ بہ ہر غم دنیا باشم
زیں سپس باقدح و بادہ و مینا باشم

ترجمہ: کب تک دنیا کے فضول چکروں میں سرگرداں رہوں اب میں جام شراب اور قلقل مینا سے میری دوستی ہوگی۔

چہ سماء حرم کعبہ چو بودم یک چند
بر در بت کدہ ہم ناصیہ فرسا باشم

ترجمہ: چونکہ چند روز حرم کعبہ کی چوکھٹ پر سجدے کرتا رہا ہوں اب کچھ دن بت خانہ کے دروازے پر جبہ سائی کرنی چاہئے۔

ای خوشا روز کہ رازم کند از پردہ برون
دست در دامن آں شوخ خود آرا باشم

ترجمہ: کتنا مبارک ہوگا وہ دن جب میری محبت کا راز فاش ہوگا اور میں اس چنچل محبوب کے دامن سے چمٹا ہوا ہوں گا۔

دامن عیش ز دستم نرود تا شبلی

دامن بمبئی از کف ندھم تا باشم

ترجمہ: شبلی اپنی قسمت میں اس وقت تک عیش ہی عیش لکھا ہے 'جب تک ہم بمبئی کے پرکیف نظاروں میں کھوئے رہیں۔

ستمبر 1906ء

غمزہ ات طرح نہد رسم جفا کوشی را
جلوہ یادت دھد از خویش فراموشی را

ترجمہ: تیرا نظریں چرا کر جانا تیری بے وفائی کا پتہ دے رہا ہے 'اور تیرا حسن مجھے وہ وقت یاد دلا رہا ہے 'جب میں عشق میں مدہوش تھا۔

بشکر معجزہ حسن کہ آں نرگس مست
بہم آمیختہ ہشیاری و مدہوشی را

ترجمہ: حسن کا کرشمہ دیکھو 'اس کی مست نرگسی آنکھوں نے عالم خواب (نیند) اور عالم بیداری کو یک جا کردیا ہے۔

ساغر زندگیم حیف کہ جز درد نداشت
جز ہمیں جرعہ آخر کہ بہ پایاں زدہ ام

ترجمہ: افسوس میری زندگی کے پیالے میں تلچھٹ (رنج و غم) کے سوا کچھ نہ تھا۔ بہ جز اس ایک گھونٹ کے جو زندگی کے آخری دنوں میں مجھے پینا نصیب ہوا۔

اندکی نیز بہ کام دل خود بنہ باشم
روز تاری چودم از دانش و عرفان زدہ ام

ترجمہ: اب مجھے کچھ باتیں اپنے دل کی مان لینی چاہئیں۔ زندگی کے تاریک دنوں میں علم و دانش کی بہت باتیں کی ہیں۔

ساغر چند بیاد رخ رنگین خوردم
قدحی چند در آغوش گلستان زدہ ام

ترجمہ: میں نے چند جام محبوب کے رخ روشن کی یاد میں نوش کئے اور چند پیالے موسم بہار کی رنگینیوں میں گم ہوکر۔

از پریشانی ایام میندیش کہ من
دست در حلقہ آں زلف پریشان زدہ ام

ترجمہ: مجھے گزرے دنوں کی پریشانیاں یاد نہ دلا۔ میں محبوب کی زُلف پریشاں کو سلجھا رہا ہوں۔

آں نگارے بہ مے چہرہ بدانساں افروخت
کاتش آوردم و در خرمن ایمان زدہ ام

ترجمہ: اس محبوب نے جب شراب پی کر اپنے چہرے کے حسن کو دوبالا کرلیا میں نے اپنے خرمن ایمان کو آگ لگا دی۔

آں شد اے دوست کہ در آراستی پیکر فن
نقش زیبا صنمی بر ورق جان زدہ ام

ترجمہ: اے دوست! وہ زمانہ بیت گیا جب میں علم و فن کے حسین پیکر تراشا کرتا تھا۔ اب تو میں نے اپنے دل کے صفحہ پر محبوب کی تصویر بنالی ہے۔

آں شدائے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم
کہ دم از صحبت آں دشمن ایمان زدہ ام

ترجمہ: اے دوست اب میں تجھے "ندوہ" کی مجلسوں میں نہیں ملوں گا۔ کیونکہ میں اس کافر ادا محبوب کی محفل میں پہنچ گیا ہوں۔

ہاں وہاں دست بدارید زمن ای احباب
کہ بہ زیبا صنمی دست بہ پیمان زدہ ام

ترجمہ: دوستو! مجھے بھول جاؤ۔ کیونکہ میں ایک خوبصورت محبوب کو دل دے بیٹھا ہوں۔

ہر یک از فتنہ گران عرب و ہند و عراق
بام حسن است و من دل زدہ طوفان زدہ ام

ترجمہ: عرب، عراق اور ہندوستان کا ہر حسین ایک دوسرے سے برتر ہے اور میں دل باختہ اس طوفان میں گھر گیا ہوں۔

کس چہ داند کہ بہ خلوت گہ آن ماہ تمام
زدہ ام ساغر و بریاد حریفاں زدہ ام

ترجمہ: کسی کو کیا معلوم میں نے اس چاند چہرہ محبوب کی محفل میں کتنے جام اپنے حریفوں کے نام لے کر پیے ہیں۔

جائی آن ست کہ گلشن دمد از کنج لبم
بوسہ ہا بسکہ برآں عارض خنداں زدہ ام

ترجمہ: میں نے اپنے اس حسین محبوب کے چہرے کے اتنے بوسے لئے ہیں کہ شاید اب میرے ہونٹوں پر پھولوں کا ایک باغ نظر آنے لگے۔

صد چمن لالہ و گل جوشدم از جیب و بغل
قرعہ فال بنام آغوشی جاناں زدہ ام

ترجمہ: میرے نام محبوب سے بغل گیر ہونے کا فال نکلا ہے۔ اب شاید میرے اپنے دامن و گریبان میں پھولوں کے باغ پیدا ہو جائیں گے۔

مگر آن بتِ خود کام زیادم نہ برد
گرہی چند در آں زلف پریشان زدہ ام

ترجمہ: میں نے اس محبوب کی زلف پریشاں میں چند گرہیں لگا دی ہیں تاکہ اگر وہ مجھے بھلانے کی کوشش بھی کرے تو نہ بھول سکے۔

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ درین گنبد گرداں زدہ ام

ترجمہ: میں نے اس گنبد گرداں (آسمان) کے اندر اتنے نغمے گائے ہیں کہ برسہا برس تک کہ دنیا کے کانوں میں میری آواز گونجتی رہے گی۔

پی تواں بردکہ ایں زمزمہ بے چیزی نیست
شبلی ایں تازہ نواہا نہ چومستان زدہ ام

ترجمہ: یہ بات بڑی واضح ہے اور سمجھ میں آسکتی ہے کہ شبلی کی اس پر کیف نغمہ سرائی کا سبب کیا ہے۔ جو کچھ اس نے کہا ہے کہ عالم ہوش میں کہا ہے۔ مدہوشی یا جنون میں نہیں کہا۔

ستمبر 1906ء

26 اکتوبر 1906ء کو مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"اب کے مخزن میں میری ایک غزل شائع ہوئی ہے۔ جا بجا غلط چھپی ہے "کافروں" کا ذکر اس میں بھی ہے۔"

اس کے بعد 13 دسمبر 1906ء کو بانکی پور سے پھر مہدی حسن ہی کو لکھتے ہیں:

"مخزن کی غزل تو ضرور نظر سے گزری ہوگی کیا اس سے بڑھ کر کوئی داخلی ثبوت ہو سکتا ہے؟

بیگم صاحبہ حمیدیہ کے خاندان سے مولانا کے دوستانہ تعلقات سفر قسطنطنیہ کے زمانے میں قائم ہوئے تھے۔ جو مئی 1892ء کا واقعہ ہے۔ اور غالباً اس وقت عطیہ ایک آدھ برس کی بچی تھی۔ یہ خاندان بمبئی کے پرانے

خاندانوں میں سے تھا۔ 1906ء تک عطیہ بیگم کے والد مرچکے تھے البتہ والدہ زندہ تھیں۔ خود عطیہ بیگم اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

"مولانا شبلی کی جب ہم سے پہلی ملاقات ہوئی تو ہمارے درمیان کوئی اجنبیت نہ تھی، وہ 1892ء میں جب استنبول گئے تھے تو میرے والد مرحوم حسن آفندی صاحب نے جو بارگاہ سلطانی میں کافی رسوخ اور ارکان سلطنت پر بہت کچھ اثر رکھتے تھے ان کی بہت خاطر تواضع کی تھی اور علی گڑھ کے پروفیسر کی حیثیت سے خاص حلقوں سے ان کا تعارف بھی کرایا تھا۔

ایک مدت بعد والد مرحوم کا انتقال ہوگیا اور ہمارے خاندان کا مستقل قیام بمبئی میں ہوا۔ ایک مرتبہ ہم بہنوں کو لکھنؤ جانے کا موقع ملا۔ یہاں شیخ مشیر حسین قدوائی بارایٹ لاء تعلقہ دار گدیہ کے دولت خانے پر مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی، جن کی علمی شہرت ہم سن چکے تھے۔ ہم بہنیں ان کی باتوں سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئیں اس وقت وہ ایک پرانے خیال کے مولوی معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد مولانا بمبئی آئے ہم سب نے بزرگ و عالم سمجھ کر بڑی عزت کے ساتھ عزیزوں کی طرح ان کا استقبال کیا، اور جب واپس ہوئے تو سلسلہ خط و کتابت جاری ہوگیا۔"

اس اولین ملاقات کے وقت جو یقیناً 27 ستمبر 1906ء سے پہلے ہوئی ہوگی۔ عطیہ ہنوز پوری طرح جوان بھی نہیں ہوئی تھی۔ خود کہتے ہیں:

غنچہ نشگفتہ جنوں، تاختن آرد بہ من
تاوگر از اثر باد بہاری چہ شود

ترجمہ: اس نوخیز کلی نے کھل کر پھول بننے سے پہلے ہی مجھ پر حملہ شروع کردیا ہے۔ دیکھیں موسم بہار (جوانی) آنے پر کیا ہوتا ہے۔

اپریل 1907ء

دل بہ آن نو برحسن از ندھم خود چہ کنم
دلم از صحبت پیران ریا ساز گرفت

ترجمہ: میں اگر اس نوخیز پیکر حسن کو دل نہ دوں، تو کیا کروں۔ میں ان ریاکار بوڑھوں کی دوستی سے تنگ آچکا ہوں۔

عشق شروع ہوا فارسی میں غزلیں کہی گئیں۔ دوستوں کو اطلاع دی گئی۔ 26 ستمبر کو بمبئی سے واپس گئے تو ان چند لمحوں کی حسین یاد بھی ساتھ تھی، جو کسی کے ساتھ گزارے گئے تھے۔ چنانچہ جب الٰہ آباد گئے وہاں کے ہوئے اشعار After Effect کی بڑی اچھی مثالیں ہیں:

من کہ در سینہ دلی دارم شنیدا چہ کنم
میل با لالہ رخان گر نہ کنم تاچہ کنم

ترجمہ: میرے اپنے سینے میں ایک دل موجود ہے، دوسروں کی سنی سنائی باتوں کا مجھ پر کیا اثر ہوگا۔ ان پھول جیسے حسین چہرے والوں سے محبت نہ کروں تو کیا کروں۔

من نہ آنم کہ بہ ہر شیوہ دل ازدست دھم
لیک با آن ھمہ حوصلہ فرسا چہ کنم

ترجمہ: میں وہ نہیں کہ حسینوں کی ہر ادا پر دل نچھاور کردوں، مگر اس کی ایک

نگاہ نے میری بلند حوصلگی کو بھی زیر کرلیا ہے۔

جہاں بزمی ست برہم گشتہ از آشوب خیزی ھا
ھنوز آں چشم پرفن برسرکارست پنداری

ترجمہ: بزم احباب کا سکون درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے 'شاید وہ عیار آنکھیں اب تک نظر بازی میں مصروف ہیں۔

فریبِ لطفِ گفتارِ ستِ خود کام را نازم
سخن می گوید از انکار و اقرار است پنداری

ترجمہ: اس خود غرض محبوب کی چالاکی پر رشک آتا ہے۔ انکار بھی کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقرار کررہا ہے۔

خیال بوسہء آں لعلِ نوشیں دوش می بستم
ھنوزم لب ذوقِ آں شکرباد است پنداری

ترجمہ: میں گزشتہ شب اس کے لب لعلین کا بوسہ لینے کے متعلق سوچ رہا تھا 'میرے ہونٹوں پر اب تک مٹھاس جمی ہوئی ہے۔

من درانجام رہِ عشق گرفتم درپیش
خنک آنکس کہ ہم این شیوہ آغاز گرفت

ترجمہ: میں نے عمر کے آخری حصے میں عشق بازی شروع کی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ابتدائے جوانی میں یہ روش اپنا لیتے ہیں۔

چہ عجب جلوہ گہِ دوست شود دیدہء من
کہ زخاک درش این آئینہ پرواز گرفت

ترجمہ: کیا تعجب ہے کہ میری آنکھیں محبوب کی جلوہ گاہ بن جائیں 'کیونکہ اس طائر چشم نے اس کے دروازے سے ہی پرواز شروع کی ہے۔

ہر کہ یک بار نظر بر رخِ خوبِ تو کشاد

بایدش دیدہ ز دیدارِ جہاں باز گرفت

ترجمہ: جس نے ایک بار تیرے حسین چہرے کو نظر بھر دیکھ لیا۔ اسے چاہئے کہ دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز ہوجائے۔

ھر جا کہ روئی روشن تو جلوہ ساز بود
ہر ذرہ را نظر بہ جمال تو ساز بود

ترجمہ: تیرا حسین چہرہ جہاں بھی جلوہ افروز ہوا۔ وہاں کا ہرذرہ تیرے دیدار سے فیض یاب ہو رہا تھا۔

جانان زبان و لب نہ شود ترجمانِ شوق
مارا امیدھا ز نگہ ہائے راز بود

ترجمہ: پیارے دوست! محبت کی باتیں زبان و لب سے نہیں کہی جاتیں 'ہمیں تیری خاص نظر عنایت درکار ہے۔

پیکر آرای ازل طلعت زیبای ترا
نقش می بست و ھم از ذوق تماشای کرد

ترجمہ: ازل کا مجسمہ ساز (خدا) تیرے حسین چہرے کے نقوش تراشے ہوئے 'خود بھی تجھے بڑی پرشوق نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اپریل 1907ء

اپریل 1907ء میں عطیہ یورپ میں تھیں اور علامہ اقبال سے ان کا میل جول شروع ہوگیا تھا۔ لیکن ابھی تخاطب MY dear miss fyzee تک محدود تھا۔ یورپ سے عطیہ ستمبر 1907ء میں لوٹیں اور دوسرا سفر یورپ اپریل 1908ء کے آخری دنوں میں کیا 'اور اسی سال اسے اپنی والدہ کی بیماری کے باعث لوٹنا پڑا۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اپریل 1907ء میں شبلی گھر

لوٹے اور حادثہ گزند پا ظہور پزیر ہوا۔ یہ حادثہ 17 مئی 1907ء کو رات کے دس بجے پیش آیا۔ اور اس کی پوری تفصیل مکاتیب میں صفحہ 168 پر خود شبلی کے قلم سے ملاحظہ ہو۔ پاؤں کٹنے کا غم مولانا کو بہت شدید تھا 'خود کہتے ہیں:

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں 'مرحوم ہوں 'معذور ہوں میں

جون اور جولائی میں مولانا چلنے پھرنے سے معذور رہے اور اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ پاؤں 9 جنوری 1908ء تک بھی نہ بن سکا۔ مولانا 21 جنوری کو بمبئی آئے اور یہاں لکڑی کا پاؤں بنوایا۔ بہت سی پرجوش غزلیں لکھیں اور پھر 6 فروری کے بعد اس چمن زار کو شداد کی طرح خیر باد کہا۔ اس زمانے میں عطیہ بمبئی میں موجود تھیں۔ شیخ اکرام ناقل ہیں:

"بمبئی میں دو مسلم خواتین کا ایک لیکچر تھا۔ ہر دو میں شمس العلما شبلی نعمانی شریک جلسہ تھے اس کے بعد ان خواتین نے (حوالہ عطیہ کی خاندانی ڈائری) ایک تاریخی تماشا (تبلو Tableau) کرنا چاہا تو تاریخی معلومات شبلی نے فراہم کیں لیکن افسوس کہ تماشے کے انعقاد سے پہلے انہیں بمبئی' چھوڑنا پڑا۔"

اس صحبت نے شعر پیدا کیے 'تو کیسے:

بے حاصلی نگر کہ باین دوری از رخش
صد جای بہر بوسہ نشان کردہ ایم ما

ترجمہ: ہماری بدنصیبی دیکھو ہمیں کس وقت محبوب سے جدا ہونا پڑا۔ ہم وصال میسر آنے پر اس رخ روشن کے بے حساب بوسے لینا چاہتے تھے۔

صرف یہی نہیں بلکہ 26 فروری 1908ء کے خط میں حبیب الرحمان خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

"اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔"

چنانچہ اپنے ذوق نظر کی تسکین کے لیے مولانا اگلے مہینے دوبارہ بمبئی جانا چاہتے تھے۔ لیکن ندوہ کی زمین اور بعض نہایت اہم معاملات میں الجھے رہے کہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ البتہ اب کے قیام بمبئی میں عطیہ سے کچھ ایسے تعلقات استوار کر آئے تھے کہ اس سے خط و کتابت جاری رکھی۔ ابتدا کے دو ایک رسمی خطوط سے ان کی سیری نہ ہوئی 'اور دوسرے ہی خط میں اسے لکھتے ہیں:

"معاف کیجئے گا میں "آپ" کی جگہ "تم" کا لفظ لکھوں گا۔ "آپ" کے لفظ میں بیگانہ پن ہے۔"

(24 فروری 1908ء)

اس زمانے میں مولانا نے عطیہ بیگم سے کھلنے کی کوششیں کیں۔ وہ ولایت جانے کی تیاری میں مشغول تھی 'اور وہ بار بار اس سے روانگی کے متعلق پوچھتے تھے۔ پھر کبھی کہتے:

"چاہتا ہوں کہ بمبئی آؤں اور روانگی سے پہلے کہیں اور چلا جاؤں"

یا پھر یہ کہ:

"میرا ارادہ قطعی تھا کہ روانگی کے وقت بمبئی میں موجود رہوں گا 'اور تمہیں خدا حافظ کہہ سکوں گا 'لیکن پھر خیال آتا ہے کہ ایک عزیز اور دوست کی رخصت کے وقت کا

میں متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"خدا حافظ" والی نظم میں تو مولانا نے کمال ہی کر دیا ہے، یعنی وہی نظم جو انہوں نے چند سال پہلے اپنے چھوٹے بھائی مہدی مرحوم کی یورپ روانگی کے موقع پر لکھی تھی تھوڑے تصرف کے ساتھ عطیہ کو بھیج دیتے ہیں۔ یعنی ایک عزیز (عزیز اس لیے کہ مرنے کے بعد مہدی حسن بھی باپ کی طرح مولانا شبلی کو عزیز ہو گیا تھا) چیز کو عزیز کے لیے قربان کر دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی جب وہ کچھ نہیں سمجھتی، تو اگلے خط میں لکھتے ہیں:

می روی وگریہ می آید مرا
ساعتی بنشین کہ باران بگزرد

ترجمہ: تو جا رہا ہے اور مجھے رونا آ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھو یہ بارش تھم جائے۔

(اپریل 1908ء)

اس زمانے میں مولانا کی شاعری کا رنگ بھی دیدنی تھا۔ ایک غزل دیکھئے:

امنی نہ ماند خلوتیانِ حجاز را
دیدی تطاول خم زلف دراز را

ترجمہ: تو نے اپنی زلف دراز کا کرشمہ دیکھا۔ اس نے حرم کعبہ میں بیٹھے گوشہ نشین عبادت گزاروں کا سکون بھی لوٹ لیا ہے۔

ذوقی دگر بود بہ تماشہ گہ وصال
چشمی خواب در شدۂ نیم باز را

ترجمہ: وصال کے موقع پر حسن کے دیدار کا اپنا لطف ہوتا ہے۔ محبوب کی آنکھوں میں نیند اتری ہو، اور وہ نیم باز آنکھوں سے عاشق کو دیکھ رہا ہو۔

ہر گاہ یکی و خونی و رعنائی تو نیست
ما دیدہ ایم کج کلہان طرازرا

ترجمہ: تیرے حسن کی کارفرمائیاں کسی ایک فرد تک محدود نہیں ہیں۔ ہم نے بڑے بڑے مغرور شہنشاہوں کے تاج تیرے قدموں پر گرتے دیکھے ہیں۔

لی چارہ نکتہ دانِ ادا ہای عشق نیست
ضائع مکن بہ غیر نگہ ہائی رازرا

ترجمہ: بچارہ (معشوق ابھی کم سنی کی وجہ سے) عشق کے رموز کو سمجھ نہیں پا رہا ہے۔ بے صبری میں اپنی نگاہ کے اثر کو ادھر ادھر ضائع نہ کر۔

ما از بلند و پست جہان در گزشتہ ایم
ازبسکہ دیدہ ایم نشیب و فراز را

ترجمہ: ہم نے دنیا میں اتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ کہ اونچ نیچ کی تمیز کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

ہر چند جورنیز زمعشوق خوش بود
ماندہ ایم دلبر عاشق نواز را

ترجمہ: اگرچہ محبوب کا ستم بھی بے مزہ نہیں ہوتا لیکن ہم اس محبوب کو پسند کرتے ہیں جو عاشق پر مہربان ہو۔

چیزی زلطف نیز بیامخت در ستم
تا اعتدال داد مئے تند ناز را

ترجمہ: اس نے اپنے طرز ستم میں کچھ مہربانی کا عنصر بھی شامل کر لیا ہے اس طرح اپنے حسن کی تند و تیز شراب کو معتدل کر لیا ہے۔

آور برم کہ کار ز اندازہ در گزشت
دست دراز گشتہ ای آغوش باز را

ترجمہ: آؤ میرے پہلو میں آکر بیٹھو اب صبر نہیں ہوتا۔ تم تو ہم آغوشی کے لیے کھلے ہاتھوں سے دور تر ہوتے جارہے ہو۔

من خود نخواہم اینکہ برافتد تجاب راز
اما چہ چارہ کلک حقیقت طراز را

ترجمہ: میں خود نہیں چاہتا کہ ہماری محبت کا یہ راز کسی پر ظاہر ہو۔ مگر اپنے حقیقت نگار قلم کو کیسے روکوں۔ وہ سب کچھ لکھ جاتا ہے۔

اسی زمانے میں (مارچ 1908ء میں) عطیہ بیمار ہوجاتی ہے۔ مولانا سمجھتے ہیں کہ ناراض ہے اس لیے خطوں کا جواب نہیں دیتی۔ چنانچہ زہرہ کو لکھتے ہیں:

"میرے خط کا جواب عزیز موصوف نے نہیں لکھا۔ شاید کسی بات سے ناراض ہوگئی ہو یا جلد جلد خط و کتابت کرنا خلاف شان سمجھا ہو۔ بہر حال میں بھی پیش دستی نہیں کرتا۔"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ہاں آپ نے پہلے خط میں صغریٰ اور فاطمہ کو بہن لکھا تھا۔ عزیزانہ تعلق تو قطعی ہے لیکن یہ رشتہ صحیح نہیں۔ حسن صاحب مرحوم عمر اور ہر حیثیت میں میرے چچا تھے۔ اس لحاظ سے رشتہ قائم ہونا چاہئے۔ میری عمر اس وقت صرف پچاس برس کی ہے۔ اتنا بڑا رشتہ میرا حق نہیں۔"

اس کے بعد جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے عطیہ دیگم یورپ کے سفر پر روانہ ہوجاتی ہیں۔ لیکن زہرہ اور ان کی والدہ بمبئی ہی میں رہتی ہیں۔ یہ واقعہ

اپریل 1908ء کے آخر کا ہے (سیر یورپ 25 اپریل 1908ء سے شروع ہوکر 17 اکتوبر 1908ء کو ختم ہوا۔ سیر یورپ، ص 3، شائع کردہ مرغوب ایجنسی لاہور، صفحہ 307) اسی دوران "دستہء گل" طبع ہوگیا۔ 2 مئی کو زہرہ کو لکھتے ہیں:

"میرا چھوٹا فارسی دیوان یعنی حال کی غزلیں چھپی ہیں اور میں نے برعکس نہند نام زنگی کافور۔ ان کاغذوں کا نام "دستہء گل" رکھ دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بھیج دوں لیکن زیادہ شوخ اور آزاد شعر قلم سے نکل گئے ہیں اس لیے ان کا پردے میں ہی رہنا مناسب ہے۔"

پھر 22 مئی کو لکھتے ہیں:

"دیوان تو نہ بھیجوں گا لیکن وقتاً فوقتاً معتدل غزلیں نکال کر بھیجتا رہوں گا۔ ندوے کا جھگڑا نہ ہوتا تو میں بمبئی میں گھر بنا لیتا۔ مسز لقمانی صاحبہ نے بھی "دستہء گل" مانگا تھا۔ میں نے ان سے بھی انکار کردیا ہے۔ کالائے بدبہ ریش خاوند۔"

اس دوران مولانا کے حوصلے بہت بڑھ چکے تھے چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ ایک رومال چکن کا جس پر عطیہ کا نام کاڑھا گیا ہو۔ یورپ بھیجیں۔ جو بھول ان کے حسب مرضی نہ بنا اس لیے نہ بھیجا گیا۔

عطیہ یورپ سے واپس آئی جس کی مبارک باد مولانا نے 17 اکتوبر 1908ء کو اس طرح پیش کی:

"ایک بے ریا دل۔ ایک مخلص دل اور ایک وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد

قبول ہو۔"

صرف یہی نہیں بلکہ اسے لکھا:

"تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ
ایک اور حقیر ہدیہ ہے۔ کیا ان دونوں چیزوں کو قبول
کر سکتی ہو!"

اور وہ حقیر ہدیہ کیا تھا اس کی تفصیل بھی خود مولانا کی زبانی سنئے:

"اپنی تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے.....
اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے۔ بھیجتا ہوں وہ میری قائمقامی
کرے گی۔"

افسوس دوسری طرف سے بھول مولوی عبدالحق صاحب کوئی اشتیاق
نہ ظاہر کیا گیا۔

نومبر کے مہینے میں عطیہ کا لکھنؤ آنے کا ارادہ ہوا۔ مولانا نے مولوی
مشیر حسین قدوائی سے سن پایا کہ وہ ان کی مہمان ہوں گی چنانچہ مولانا 7
نومبر 1908ء کے خط میں یوں خفا ہوتے ہیں:

"اگر آپ لکھنؤ آکر کسی اور کی مہمان ہوں گی تو اس
زمانے میں لکھنؤ چھوڑ کر چلا جاؤں گا"

لیکن معلوم ہوتا ہے یورپ سے واپسی کے بعد عطیہ شبلی سے کچھ دور
دور سی ہوگئی تھیں۔ اس لیے لب و لہجہ کا مولانا نے ایک جگہ یوں گلہ کیا
ہے:

"یورپ نے آپ کو ہم لوگوں کی سطح سے بہت
بالاتر کردیا ہے۔ اس لیے یہ توقع کہ آپ اسی طرح ہم سے
ملیں یا ان اطراف کا قصد کریں جیسا کہ وعدہ کیا تھا اب

صحیح نہیں۔ خط کی تحریر بھی بہت روکھی اور خود دارانہ
ہے۔"

اسی زمانے کے علامہ اقبال کے عطیہ کے نام خطوط میں قدم قدم پر
خلوص، ہمدردی اور رنگینی بڑھتی نظر آتی ہے۔

شبلی، عطیہ کے مشیر حسین صاحب کے ہاں قیام کا گلہ اپنی اس
زمانے کی غزلوں میں بھی کرتے ہیں:

شاید آں در باغ در ہجر تو زار افتادہ اند
این قیاس از نرگسی بیمار می بائست کرد

ترجمہ: شاید تیرا عاشق تیرے فراق میں صحن چمن میں بیمار پڑا ہے۔ نرگس
کی بیمار آنکھوں سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔

شرط ہمت نیست تنہا بادہ و ساغر زدن
محتسب رانیز با خود یاد می بائست کرد

ترجمہ: تنہا بیٹھ کر شراب نوشی کرنا شریفوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر
اپنے پرانے حریف محتسب کو بھی یاد کرلینا چاہئے۔

شیوہ ہائی دلبری را خوب می داند ولی
آنچہ بما کرد با اغیار می بائست کرد

ترجمہ: وہ محبوبیت کے طور طریقوں کو نبھانا خوب جانتا ہے۔ لیکن اس نے
جو کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے، وہ دشمنوں کے ساتھ کرنا چاہئے تھا۔

بلبلاں ہم چشم لطفی ای چمن پیرای صبح
آنچہ باگل کردئی باخار می بائست کرد

ترجمہ: اے صبح چمن کی آرائش کرنے والے! تو دشمنوں پر مہربان ہے۔ تو نے
جو سلوک پھولوں کے ساتھ کیا ہے وہ تو کانٹوں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔

بوسہ تنہا نشنید خمیازۂ ذوق مرا
تلخی دشنام ہم درکار می بائست کرد

ترجمہ: صرف بوسہ میرے شوق کی پیاس نہیں بجھا سکتا۔ اس میں گالیوں کی تلخی بھی شامل کرلو۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

25 اکتوبر 1908ء

آن قدر محو تماشای جمالش بودم
کہ نگہ را خبر از لذت آزار نماند

ترجمہ: میں اس حسن کے جلووں میں ایسا محو ہوا کہ وہ غصہ میں مجھے کیا کہتا رہا، مجھے اس کا قطعاً احساس نہ ہوا۔

کار آں نرگس مستانہ بود ایں کہ ہمن
نگہی کرد کہ با ہیچ کسم کار نماند

ترجمہ: یہ اس کی مست نرگسی آنکھوں کا جادو ہے کہ اس نے مجھے ایک بار نظر بھر کر دیکھا اور میں دنیا جہان سے بیگانہ ہوگیا۔

یا جگر کاوی آں نشتر مژگان کم شد
یاکہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

ترجمہ: یا اس کی پلکوں کے نشتر کی دھار کند ہوگئی ہے۔ یا مجھے زخم کھانے کی عادت سی پڑ گئی ہے کہ بڑے سے بڑا زخم لگنے پر بھی مجھے تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

فتنہء حسن تو ازیں کہ جہاں برہم زد

درمیاں تفرقہ مسجد و زنار نماند

ترجمہ: تیرے حسن کے جادو نے لوگوں کو ایسا مدہوش کیا ہے کہ لوگوں کے اندر سے مسجد و مندر (باہم مذہبی اختلافات) کی تمیز ہی اٹھ گئی ہے۔

27 اکتوبر 1908ء

ہمہ رنجوری این خستہ زبیمار گزشت
عیسیٰ آخر زعلاج دل بیمار گزشت

ترجمہ: اس مریض عشق کی بیماری ناقابل علاج ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ عیسیٰ مسیح (حکیم خادق) نے بھی اس کے علاج سے معذوری ظاہر کردی ہے۔

بی سبب نیست کہ یوسف زبہا افتاد است
دلبر شوخ من ازخانہ بہ بازار گزشت

ترجمہ: بازار حسن میں یوسف کی قیمت بلاوجہ کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا محبوب اس بازار سے گزرا ہے۔ اس کے حسن کے سامنے یوسف کے حسن کی قدر گھٹ گئی ہے۔

آہ جاں سوز کہ در سینہ ام آرام گرفت
این ہماں است کہ از گنبد دوار گزشت

ترجمہ: میری یہ آہ جو اب سینہ میں گھٹ کر میرے دل کو جلا رہی ہے۔ وہی آہ ہے جو کبھی آسمانوں کے پردے چاک کردیا کرتی تھی۔

داد ازیں پیری بی صرفہ کہ ناخواندہ گزشت
آہ ازاں عہد جوانی کہ بہ ناچار گزشت

ترجمہ: اس بے مصرف بڑھاپے سے خدا بچائے، جو بن بلائے آگیا ہے۔ افسوس اس جوانی پر جو بے لطف گزر گئی۔

27 اکتوبر 1908ء

یک سرو صدگونہ سودائے نہانی داشتم
یاد آن روزی کہ من باخود جہانی داشتم

ترجمہ: ایک وقت تھا کہ میں اپنے ایک دماغ میں سینکڑوں خیالات لیے پھرتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں نے اپنے دل میں خیالات کی ایک دنیا آباد کر رکھی تھی۔

یاد آن روزی کہ پنہاں از حریف بدگماں
آشتی ہائی نہاں با پاسبانی داشتم

ترجمہ: یہ وہ وقت تھا جب میں نے رقیب سے بھی درپردہ صلح کر رکھی تھی حالانکہ وہ میری ہر حرکت پر نظر رکھتا تھا۔

یاد آن روزی کہ دست افشاں گزشتم از حرم
از غرور آنکہ من ہم آستانی داشتم

ترجمہ: ایک وہ وقت تھا جب میں کعبہ کو بھی دور سے سلام کرتا ہوا گزر جایا کرتا تھا۔ کیونکہ میں نے بھی اپنی ایک سجدہ گاہ بنا رکھی تھی۔

شبلیؔ آن جلوۂ نیرنگہائی بمبئی
بودتا وقتی کہ من خوابی گرانی داشتم

ترجمہ: شبلیؔ! جب بمبئی کی رونقیں دیکھنے کا وقت تھا اس وقت تو غفلت کی نیند سویا ہوا تھا۔

یکم نومبر 1908ء

ازہمہ طفل بودہ و کار آشنا نبود
جوری کہ کردہ است بطور جفا نبود

ترجمہ: وہ محبوب اتنا کم عمر ہے کہ معاملات عشق کو نہیں سمجھتا۔ اس نے جو ستم کیے ہیں 'وہ جفا سے نہیں نادانستگی 'میں کیے ہیں۔

دل را بدیں فریب تسلی دہم کہ یار
باما ازاں نساخت کہ زود آشنا نبود

ترجمہ: میں اپنے دل کو یہ جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا رہا ہوں۔ وہ (محبوب) اس لیے بے پردہ سامنے نہیں آیا کہ ہم سے پوری طرح واقف نہ تھا۔

آن بزم ناز ہمہ ز بیگانہ پر شداست
دیدم کہ جائی یک تنگہ آشنا نبود

ترجمہ: اس (محبوب) کی محفل میں سب ہمارے رقیب ہی بیٹھے تھے۔ میں نے بہت غور سے دیکھا مگر کوئی ہمارا شناسا نظر نہ آیا۔

محروم ماندہ ایم ہنوز از شمیم زلف
وین شکوہ از تو بود ز باد صبا نبود

ترجمہ: ہم اب تک تیری زلف کی خوشبو سے محروم ہیں یہ شکوہ ہمیں تجھ سے ہے 'باد صبا سے نہیں۔

یکم نومبر 1908ء

ی نرنجم اگر وفا نہ کند ۔ یار زود آشنا چنین باشد

3 نومبر 1908ء

ترجمہ: مجھے اس کی بے رخی کا گلہ نہیں' جلد بے تکلف ہو جانے والے ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔

حرف انکار ز خوباں ہمہ از دل نبود

گہ گہ ایں کار بہ آئین حیا نیز کنند

ترجمہ: حسینوں کا انکار اکثر دل سے نہیں ہوتا۔ بارہا حیا و شرم کی وجہ سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

5 نومبر 1908ء

عطیہ کچھ کچھ الگ ہی رہی۔ اگرچہ بمبئی کا مہمان جب آیا 'انہیں کے ہاں ٹھہرا' مہدی حسن کو 26 نومبر 1908ء کو لکھتے ہیں:

"آج کل بمبئی کا مہمان حسن اتفاق سے یہیں ہے 'یہ لفظ یعنی اس کا پہلا جزو کبھی اس سے عمدہ تر موقع پر استعمال نہ ہوا ہوگا۔ لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ ندوہ کے بدمزہ کاموں نے دماغ کو اس قدر بدتر کر دیا ہے کہ ایسے موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ نہ وقت نہ دماغ حسرت کا بھی اس سے بڑھ کر مظہر دنیا نے نہ دیکھا ہوگا۔ ان صحبتوں میں اس کی قابلیتوں کے حیرت انگیز پہلو نظر سے گزر رہے تھے۔۔۔ آنچہ (یعنی: جو خوبیاں لوگوں میں جداگانہ طور پر ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں) عالم ہمہ می داشت تو تنہا داری ۔۔۔افسوس غیرت اور محبت کی کش مکش تھی ورنہ تم دیکھتے جو میں کہتا ہوں۔"

اور مولانا کیا کہتے تھے؟ وہ تو بار بار یہی کہتے تھے کہ:

خنک آں کس کہ بہ ذوق نظری قانع شد
وای بر من کہ صد اندیشہ باطل دارم

ترجمہ: وہ شخص سکون و اطمینان محسوس کر سکتا ہے جو اس کی ایک نظر سے

مطمئن ہو جائے۔ میں کیا کروں کہ میرے سینے میں جذبات کا طوفان آیا ہوا ہے۔

مہدی حسن کو اگلے خط مورخہ 12 دسمبر 1908ء میں لکھتے ہیں:

" ندوے کے بدمزہ اشغال نے دل اور آنکھوں کو اپنا کام کب کرنے دیا کہ کچھ دیکھتا دکھاتا۔ اب تک وہ خمار نہیں اترا۔ سو طرح چاہتا ہوں کہ اس (ندوہ) دام سے دو دن کے لیے چھوٹ سکوں 'لیکن اور زیادہ الجھ جاتا ہوں ..... ٹرکی کی ارتقائی حالت کی نسبت سلطان جمال کی رائے بالکل عام دنیا سے مختلف ہے 'یہاں بھی یکتائی کی شان ہے۔"

مگر اس کے باوجود جب محبوب ان کے پاس آیا تو ان کی شاعری میں وہ گرمی پیدا نہ کر سکا اس لیے کہ حرف انکار درمیان میں تھا۔ اس زمانے کی غزلوں کے بارے میں مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"بوئے گل کی نسبت اہل نظر کی رائے ہے کہ دستہء گل اور اس میں جذب و سلوک کا فرق ہے۔"

واقعی دونوں کی شان نزول اس قدر مختلف ہے۔ ایک شعر میں خود یہ راز کھل گیا ہے:

یا جگر کاوی آن نشتر مژگان کم شد
یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

ترجمہ: یا تو اس کے تیر نظر کی تیزی و طراری میں کمی آگئی۔ یا میرے ہی زخموں سے تکلیف کی شدت سے لطف اندوزی کا احساس ختم ہو گیا ہے۔

تاہم مولانا کا عشق اپنے عروج پر تھا۔ 1909ء کا سارا سال ان کی

زندگی کا کامیاب دور ہے۔ چنانچہ 24 مئی 1909ء کو لکھتے ہیں:

"عطیہ خدا ایسا موقعہ لائے کہ چند روز حجیرہ میں رہ سکوں یا بمبئی میں ماؤنٹ روڈ پر 'لیکن کیا اس کی توقع ہے؟"

اس زمانے میں مولانا کا عشق جنون کی حدوں تک پہنچا ہوا تھا۔ کبھی عطیہ کو نور جہاں بنا کر اشعار میں اس کے ذکر کی وجہ تلاش کرتے 'کبھی اپنے اشعار کی تشریح کر کے موقع و محل پیدا کرتے۔ کبھی اسے موسیقی کی تلقین کرتے اور اس کے انداز تحریر کی داد دیتے:

"ان باتوں کے ساتھ اگر تم موسیقی سے بھی واقف ہو تو تم اجازت دو کہ لوگ تم کو پوجیں۔" وانا اول العابدین۔" (ترجمہ : مجھے اپنے پرستاروں کی صف میں پائے گی۔)

حالانکہ مقصود صرف "انا اول العابدین" ہی تھا۔ یہاں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ عطیہ بیگم 'جیسا کہ خود شبلی کے بیانات اور عطیہ کی اپنی تحریرات (دیباچہ خطوط اقبال) سے ظاہر ہوتا ہے بڑی ذہین عورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ علامہ شبلی کو جو بات سب سے زیادہ دلکش نظر آئی 'وہ اس کی مردانہ صفات ہیں چنانچہ اسی خط میں آگے جاکر لکھتے ہیں:

عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ دینوی اور معاشی علوم کم پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ وہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں لیکن یاد رکھو مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کئے اس بل پر کئے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔ تم عورتوں کا بہادر اور دیوپیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو 'لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا

چاہئے۔ جمال حسن نزاکت پر موقوف نہیں۔ تنومندی دلیری 'دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن و جمال قائم رہ سکتا ہے۔ مرد نما عورت 'زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہو سکتی ہے۔

اس کے بعد پھر اسی موضوع پر اگلے خط میں لکھتے ہیں:

"عورتوں کی دیوپیکری پر تم نے اس قدر طولانی تقریر لکھی۔ لیکن میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ یہ تو علم ہے کہ صحت کیلئے 'تندرستی کے لیے 'جسم کی موزونی کے لیے 'جامہ زیبی کے لیے 'مردانہ ورزشیں مفید ہیں۔ جو کچھ بحث ہے وہ یہ ہے کہ عورتوں کے زنانہ حسن میں فرق آتا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے جمال اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ صرف میری رائے نہیں 'بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔"

اس طرح شبلی " سلطان جمال " کو اشارے کنائے سے سمجھاتے رہے اور اس میں مردانہ صفات کا سراغ لگاتے رہے۔ ایک دفعہ تو کھلے لفظوں میں اس کا اعتراف بھی کر گئے۔ عطیہ کی مردانگی ان کی نرگسیت کے باعث محبت پر مجبور ہوتی رہی۔ مولانا نے بقول "حالی" گرما گرم اشعار کی تشریح عطیہ کو ایک خط میں لکھی 'اور یوں رقم طراز ہیں:

" مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں۔ لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو۔ مجھ کو بے انتہا مسرت ہوئی کہ تم نے میری تشریح اشعار کو 'اور خود اشعار کو پسند کیا۔ ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہے۔"

اس آخری فقرے میں نہ جانے کتنی آرزوئیں دبی ہوئی ہیں۔

اس زمانے میں عطیہ کے نام اقبال کا پہلا خط Dear Miss Atyya کے القاب سے آتا ہے۔ جس کی تاریخ 13 جنوری 1909ء ہے۔ پھر 17 اپریل 1909ء کو My dear miss atyya ہو جاتی ہے۔ اور علامہ اقبال اپنے گھریلو واقعات اور اپنی بیوی کے بارے میں اسی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد پرخلوص خطوط کا یہ سلسلہ 17 اپریل 1910ء پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔

اقبال اپنی شادی کے مخالف تھے 'اس دوران میں وہ ملک چھوڑ جانا چاہتے ہیں۔ عطیہ کو اپنا غم گسار جانتے ہوئے اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتے ہیں 'اور یہ ان کی دریا دلی کا ثبوت تھا۔

اس موقع پر ان خطوط میں ایک فقرہ آتا ہے۔ You should be more careful معلوم نہیں اس کا یہاں کیا موقع تھا؟ کیونکہ اوپر کے پیرے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔

بہر حال شاید عطیہ مولانا شبلی پر دلنوازی کا حق کچھ زیادہ ہی جتانا چاہتی ہے۔ وہ فرمائش کرتی ہے 'لیکن ایسی نہیں کہ مولانا کے بس کا روگ نہ ہو۔ وہ خود کو شہرت دوام دینے کے لیے اپنے نام ایک تصنیف کو معنون کرانے کی خواہش کرتی ہے۔ مولانا کے دل میں نہ جانے کتنی امنگیں چٹکیاں لیتی ہیں مگر من و اندیشہ ہائے دوردراز کے مصداق وہ اس بات کو کسی موزوں تر وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں:

"عطیہ تم سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کوئی
کتاب تمہارے نام معنون کر سکوں۔ یہ وقت ضرور آئے گا
لیکن کب آئے گا 'اس فیصلہ آج نہیں کر سکتا۔"

لیکن بات کل پر ٹال دینے سے وہ اپنے دل کی آواز دبا نہیں سکے۔ پھر

کہتے ہیں:

"عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب
کرو اور میں یہاں سے بھیجوں۔ لکھنؤ میں کوئی چیز
تمہارے قابل نہیں۔"

19 اگست 1909ء کو لکھتے ہیں:

" شعراء اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا
متانت بلاغت اور لطافت خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ جہانگیر
بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے عموماً نور جہاں بیگم کا
نام لاتے تھے 'اس اصول پر میرا شعر ہے:

نازم کہ ایں عطیہ فیض امیرہ ایست
کاوازہ سخاش بہ عالم رسیدہ است

ترجمہ: مجھے فخر ہے کہ یہ ایک امیر و سخی عورت کا عطیہ ہے جس کی سخاوت کی شہرت دنیا میں پھیل چکی ہے۔

اور یوں تو صراحتاً تمہارے لیے وداعیہ غزل خیر مقدم وغیرہ لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔"

یہ کتنے کھلے ہوئے اشارے تھے 'چنانچہ عطیہ نے لکھا:

"جنیرہ آؤ اور جب چاہو واپس جاؤ۔"

لیکن محض ناگزیر حالات کی بنا پر مولانا نہ جاسکے۔ عطیہ نے ان کے اس فعل پر طعنہ دیا 'جس کے جواب میں مولانا اسے لکھتے ہیں:

" تم کہتی ہو میں بد ہمت ہوں۔ میری زندگی
کے دو حصے ہیں پرائیویٹ اور پبلک ۔اگر پبلک کام میرے

ہاتھ میں نہ ہوتا تو تم میری ہمت کا اندازہ کر سکتیں۔"

(19 اگست 1909ء)

لیکن یہ بات انہیں کھٹکتی رہی چنانچہ 28 اگست 1909ء کو انہیں آخر یہ کہتے ہی بنی:

زودی آیم و این ہم دیر است

ترجمہ: میں جلد آرہا ہوں' لیکن یہ بھی ایک طرح سے دیر ہی ہے۔

وا حسرتا کہ اب کے پھر نہ جا سکے۔ مگر تاپ کے۔ آخر ندوہ کے کاموں سے وقتی رہائی پائی۔ چنانچہ ماہ اکتوبر کو بمبئی سے جنجیرہ پہنچے۔ ان وقتی مصروفیات میں ایک مصروفیت یہ تھی کہ ان کی لڑکی فاطمہ سخت بیمار تھی اور بغرض علاج لکھنؤ میں آئی ہوئی تھی۔ اور مولانا اسے واپس گھر بھیجنے کا بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔ بیٹی کو شک ہوگیا' اور اس نے خط لکھا' جس کے جواب میں مولانا کہتے ہیں:

"فاطمہ! نہ میرا پہلے خیال تھا' نہ اب ہے کہ تم کو جلد رخصت کروں۔ تمہارا علاج سب سے مقدم ہے۔ تم نے خود ہی لکھا تھا کہ مجھ کو دو چار دن میں جانے دیجئے' اس پر میں نے لکھ دیا تھا۔ میری طبیعت اب تک اچھی نہیں' ورنہ تم سے خود آکر یہ باتیں کہتا۔ (یہ رقعہ دفتر سے مکان پر بھیجا گیا)

29 جولائی 1909ء

مئی کو دوسرا خط انہوں نے جنجیرے سے لکھا تھا' جس میں ذکر کیا تھا کہ چند روز ابھی سفر میں گزریں گے۔

اب مولانا کا عشق کامیابی کی انتہائی حد کو پہنچ گیا۔ اس کی ایک

قطعہ ہے:

کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی' تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکر وضو ہوگی' تو کیوں ہوگی
جو دو دن بھی بسر کرنے کا' اس قصر معلی میں
اسے خلد بریں کی آرزو ہوگی' تو کیوں ہوگی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر مے و جام و سبو ہوگی' تو کیوں ہوگی
جناب نازلی بیگم کو اور نواب صاحب کو
کسی شے کی جو دل میں آرزو ہوگی' تو کیوں ہوگی
کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں
عطیہ تم کو یاد لکھنؤ ہوگی' تو کیوں ہوگی

اس قیام کی تفصیل عطیہ بیگم اپنی خاندانی ڈائری میں (حوالہ اکرام) یوں دیتی ہیں:

"آخر مولانا شبلی صاحب اور مشیر حسین قدوائی صاحب یہاں تشریف لائے۔ مدتوں سے وعدہ تھا۔ مگر ہمارے شکر کہ اجرا ہوا۔ اکتوبر کو یہاں آئے اور ہفتہ بھر ٹھہرے۔ مولوی صاحب نے یہاں پہنچتے ہی چند اشعار اس جگہ کے متعلق کہے..... کسی کو یاں خدا"

اس کے دو دن بعد 17 اکتوبر کو مولانا بمبئی پہنچے اور ذیل کا قطعہ لکھا:

یاد صحبت ہائے رنگین جو جزیرے میں رہیں

وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا
لطف تھا ذوق سخن تھا صحبت احباب تھی
مطرب و دور و سرور و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرت خلدبریں ہر گوشہ ویرانہ تھا
غنچہ و گل کا تبسم تھا ہر اک دم برق ریز
عندلیبوں کی زباں پر نالہ مستانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہ مست ساقی اس قدر
خود بخود لبریز مے ہر ساغر و پیمانہ تھا
اب نہ وہ صحبت نہ وہ جلسے نہ وہ لطف سخن
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اس دوران میں مولانا کی عدم موجودگی میں فاطمہ فوت ہوگئی۔ اب عطیہ کی طرف سے ردعمل شروع ہوچکا تھا۔ چنانچہ عطیہ نے خط کے ذریعے کنایہ والے شعر پر ناراضگی کا اظہار کیا، اس پر مولانا لکھتے ہیں:

"اچھا ہوا کہ میں نے ان سطروں کے معنی تم سے دریافت کیے، ورنہ ممکن تھا کہ میں تمہارا نام اسی طرح کسی موقع پر لاتا اور تم کو رنج ہوتا۔ لیکن مجھ کو حیرت ہے کہ تم یہ کیونکر سمجھتی ہو کہ وہ تمہارا نام ہے، عطیہ کے معنی داد و دہش اور انعام کے ہیں اور اسی معنی میں استعمال کرتا ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اتفاق سے یہی تمہارا نام بھی ہے۔ غیر آدمی کیونکر جان سکتا ہے کہ میں نے تمہارا نام لیا۔ اس لیے تم کو رنج کرنے کی کیا وجہ؟

بہر حال آئندہ نہ لکھوں گا۔"

اس کے بعد اگلے دنوں میں جابجا مولانا جزیرے کی صحبت کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً اس خط میں آگے چل کر عطیہ کو لکھتے ہیں:

"جزیرے کا خواب بیداری میں بھی نظر آتا ہے۔"

(17 اکتوبر 1909ء)

اس کے بعد مولانا ندوہ کے کاموں میں مصروف ہوئے۔ ہواری بیگم نازلی بیگم (عطیہ کی بہن) سے رکھوانا چاہا۔ ملاؤں نے مخالفت کی چپ ہوگئے۔ علی گڑھ کا سوال اٹھایا۔ مولانا نے جلسوں میں بہت کچھ کہا۔ عطیہ کو یہ بھی برا معلوم ہوا۔ اس نے غضب آلود خط لکھا۔ جنوری 1910ء کو مولانا لکھتے ہیں:

"امید ہے کہ آپ خط کے بعد غیظ و غضب کو دور فرمایئے گا، اور قدیم مراسم قائم رہیں گے۔"

یاد رہے کہ اس خط میں القاب جائے عزیزی یا قرۃ العین کے "خاتون محترم" لکھا ہے۔

اس کے بعد مولانا نے کئی خط لکھے۔ عطیہ نے جواب نہ دیا۔ آخر اکتوبر میں اس نے ایک خط لکھا۔ مولانا جواب میں لکھتے ہیں:

"مدت کے بعد تم نے یاد کیا، دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہوگئے۔"

جب مولانا کو یہ چشمہ سراب بنتا نظر آیا تو انہوں نے اپنے لردگرد نظر دوڑائی۔ نگاہ بار بار ابوالکلام آزاد اور مہدی حسن کی طرف اٹھتی تھیں۔

دسمبر 1909ء کو ابوالکلام سے شبلی کے تعلقات خراب ہوگئے تھے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب بقول خود ابوالکلام آزاد کے ان کی عمر اکیس بائیس سال کی تھی۔ مولانا انہیں ایک مختصر خط میں لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا تھا کہ آپ نے میری نیازمندی کو
تسلیم کرلیا ہے۔ لیکن جب جلی کے آرام سے ثابت ہوا ع
خود غلط بود الخ یہ بھی بار بار لکھنے کی بات تھی؟"

انہی دنوں مولانا شبلی کا ندوہ میں ٹھہرنا ناممکن ہوگیا تھا اور ان پر علماء کی طرف سے جو الزامات عائد کیے گئے تھے ان میں ابوالکلام آزاد کی "محبت" بھی تھی۔

"ہاں انہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے!"

مولانا ندوہ میں اس بار تو رہ گئے لیکن "آزاد کے ساتھ تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا اور انہیں کئی معذرت آمیز خط لکھنے پڑے۔" مہدی حسن سے انہوں نے لاکھ کہا کہ وہ انہیں اپنے گھر بلائیں اور اپنی نئی بیوی سے متعارف کرائیں لیکن وہ کچھ بدک گئے تھے۔ اس لیے کہ عطیہ والے معاملے میں راز دار وہی تھے۔ مہدی حسن صاحب ایسے "نفوس قدسیہ نے ساٹھ سال کی عمر میں" بیوی کو پردہ کرانے پر مصر رہے۔ عطیہ بھی بیزار رہیں۔

اسی سال کے آخر میں 1910ء رسمی مراسم کا سلسلہ اگرچہ استوار ہوگیا اور ابوالکلام سے جس رسمی تعلق ہی پر اکتفا کا ارادہ ظاہر کیا تھا 'عطیہ کے بارے میں سچ ثابت ہوا۔ دسمبر 1910ء کو الہ آباد میں نمائش تھی۔ عطیہ وہاں تھیں 'مولانا شبلی بھی پہنچ گئے۔ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ عطیہ اس کا تذکرہ طنزیہ انداز میں اپنی خاندانی ڈائری میں یوں کرتی ہیں:

"ان ایام میں مولانا شبلی بھی تشریف رکھتے تھے
اور اکثر ہماری ملاقات کے لیے آتے تھے۔ اور بلاناغہ ایک
خوان عمدہ اور اعلیٰ پکوان کا بھیجتے تھے۔ بچارے بڈھے میاں
گو کہ پرانی وضع کے ہیں 'مگر خیالوں میں وسعت ایسی ہے

کہ کاش آج کل کے نئی روشنی والوں میں ذرہ سی یہ بات
ہوتی۔"

بڈھے میاں کی اس پھبتی میں عمر کا جو فرق قائم کیا گیا ہے 'وہ اس سے پہلے کے کسی خط میں نہیں۔ مولانا شبلی کو اس انداز نظر کا تھوڑا بہت احساس تھا۔ چنانچہ 12 اپریل 1911ء کے خط میں لکھتے ہیں:

"نہیں معلوم کہاں جاؤں۔ جزیرے کی کشش میں ذرا شبہ
ہوگیا"

دراصل مولانا نے احتیاط سے کام لے کر "شبہ" کا لفظ استعمال کیا تھا ورنہ معاملہ زیادہ ہی بگڑ گیا تھا۔ چنانچہ ان واقعات کے بعد ایک مرتبہ عطیہ جب بمبئی آئی 'تو اتفاق سے مولانا بھی وہیں تھے۔ لیکن بدلتے حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ ان سے ملے بغیر واپس چلی گئی۔ مولانا سے نہ رہا گیا۔ 28 مئی 1911ء کو ایک خط لکھا اور اس میں گلہ کیا۔ صرف گلہ۔ کیونکہ اب آہوئے رمیدہ کو کون پکڑ سکتا تھا 'اور پھر پابریدہ کہاں تک تعاقب کرتے۔ تھک ہار کر رہ گئے۔ ابوالکلام سے بھی بگاڑ ختم نہ ہوسکا۔ 18 اگست 1911ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آپ کا لہجہ اگرچہ اب تک نہیں بدلا 'لیکن خدا
یہ امید قائم ہے کہ کلکتہ پہنچوں گا تو آپ سخت دلی سے
کام نہ لے سکیں گے اور ظاہری طور پر سہی لیکن قدیم
عنایتیں پھر مبذول ہوں گی۔ اور میرے لیے اسی قدر کافی
ہے۔ پھر وہ مجاز رفتہ حقیقت بن جائے گا۔ ان باتوں کے
ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت سے منفعل ہوجاتا ہوں
کہ جرم سخت ہے 'بلکہ سخت تر۔ لیکن جس سے معاملہ ہے

اس کا دل بھی اس قدر نرم بلکہ نرم تر ہے۔"

مہدی حسن بھی بیگم صاحبہ کو چھا لے گئے۔ ادا کلام بھی گئے اور پھر عطیہ بھی گئیں۔

نی ذوق نگاہی و نہ ہنگامہ عشقی
ای وای بہ شہری کہ درو فتنہ گری نیست

ترجمہ: نہ کوئی منظور نظر نہ کوئی عشق و محبت کی کہانی۔ کیا اس شہر میں کوئی رونق ہو سکتی ہے جہاں کوئی فتنہ گر نہ ہو۔

یہ مولانا کا اسی زمانے کا شعر ہے۔

عطیہ والے معاملے نے بہت جلد انتہائی شکل اختیار کرلی۔ 7 جولائی 1911ء کو علامہ اقبال کے خطوں کا القاب بھی "مائی ڈیئر مس فیضی" ہوگیا۔ ایک تقریب میں علامہ اقبال نے عطیہ کی ڈائیری مانگ کر اس میں یہ شعر لکھا:

عالم جوشِ جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہیے کیا حکم ہے 'دیوانہ بنوں یا نہ بنوں!

اور پھر ایک منحوس صبح کو مولانا کو معلوم ہوا کہ عطیہ کسی اور کی ہوگئی ہے۔ اس نے ایک یہودی سے شادی کرلی۔ کون جانتا ہے اس وحشت ناک خبر سے ان پر کیا گزری ہوگی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد مہدی حسن کو لکھتے ہیں:

"قرآن میں ہے کہ یہودی ذلیل و خوار بنا دیئے گئے ہیں۔ لیکن کیا 5 دسمبر 1912ء کے بعد بھی 'جس دن کہ ..... ایک یہودی کے ہاتھ آئی۔ مشہور کیا گیا ہے کہ

وہ مسلمان ہوگیا۔ اس لیے تو نہیں:

ع میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلمان ہوگیا۔

خیر ا ع بحہ را زنار کر دست و کند

ترجمہ: ایسا ہوتا رہا ہے کچھ لوگ زنار کو رشتہ تسبیح کا نام دے کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔

(13 دسمبر 1912ء)

اور پھر عطیہ کو لکھا:

بتانِ ہند کافر کرلیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلماں ہے

وہ خوش نصیب یہودی ایک مشہور آرٹسٹ رحمین تھا۔

اس کے بعد مولانا فیضی خاندان سے ملتے تو رہے 'لیکن جذبات کا وہ طوفان جو چند سال قبل کی فارسی غزلیات میں موجزن تھا 'اب تھم چکا تھا۔ مولانا شعر اب بھی کہتے تھے 'لیکن:

شبِ وصل است حیا گر بحواری چہ شود
یک دمم تنگ در آغوش فشاری چہ شود

ترجمہ: شب وصال ہے 'حیا کا پردہ درمیان سے اٹھ جائے 'تو اچھا ہے۔ خود بڑھ کر مجھ سے بغل گیر ہو جاؤ تو کتنا لطف آئے۔

بوسہ ھا برلب نوشین تو دام است مرا
دام من ہم بہ من ار باز سپاری چہ شود

ترجمہ: تمہارے لبوں پر میرا ایک بوسہ قرض ہے۔ اگر میرا یہ قرض مجھے واپس دے دو تو اچھا ہے۔

ایسے اشعار کی جگہ اب ان کی زبان پر کچھ اس قسم کے اشعار ہوتے تھے:

بس کہ غارت گر حسن تو جہان برہم زد
یوسف از خانہ بروں جست و بہ بازار افتاد

ترجمہ: تیرے حسن غارت گر نے وہ ہنگامہ برپا کیا ہے کہ یوسف جیسا حسین گھر کی چار دیواری سے نکل کر بازار میں آگیا ہے۔

شیوۂ مہر ز خوباں نتواں داشت طمع
کہ مرا کار بایں طائفہ بسیار افتاد

ترجمہ: حسینوں سے وفا کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ میں نے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔

یہاں عطیہ ایک عورت نہیں رہتی 'بلکہ تمام دنیا کی عورتوں کے لیے ایک جنسی علامت بن جاتی ہے 'جس کی شادی بازار میں بک جانے کے مترادف ہے۔ از خانہ بروں جست گھر سے نکل کر بازار میں آجانا۔ اس طرف مولانا کا ہندوستانی ذہن کیوں گیا ہے ؟ غور فرمایئے۔

اس شکست کے ساتھ ہی ندوہ کے میدان میں بھی آخر عمر میں مولانا کو شکست ہوگئی 'اور شیخ الکل بننے کے جو خواب وہ دیکھا کرتے تھے رفتہ رفتہ ختم ہوگئے۔

"نتیجہ یہ ہوا کہ گو انہوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ سے مار کھا گئے۔ جس کا ان

کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا۔ اور خود وہ بھی اپنی محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔"

ندوے کی بساط پر انہوں نے سماجی معاشی ' اقتصادی اور سیاسی ہر طرح کے مہرے پھیلائے ۔ لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی 'اس زمانے کی سیاسی شاعری کے اشعار طنز کے نشتر ہیں 'جو لازماً اپنی تمام تر ناکامیوں کا نتیجہ تھے۔ اردو میں ان کے اشعار کا یہی پہلو انہیں اپنے معاصر شاعروں سے الگ کرتا ہے۔ ان اشعار کی کاٹ اور تیزی سے بڑے بڑے سورما تھرانے لگے 'کیونکہ امرت زہر میں تبدیل ہوچکا تھا اور زیر شاخ گل بلبل نہیں 'بلکہ افعی سوتے تھے۔

ایسی عظیم شخصیت کا نوحہ ایسی طنزیہ شاعری ہی ہوسکتی تھی۔

شبلی ناکام جئے اور ناکام مرے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے 'اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ۔

اعتراضات اور ان کے جواب

اس مضمون کی پہلی اشاعت کے بعد اولی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ خود محترمہ عطیہ بیگم کو ایک مضمون بعنوان " شبلی اور خاندان فیضی " لکھنا پڑا۔ بعد ازاں کوئی نوے صفحات کا مضمون میرے خلاف خالد حسن صاحب قادری نے نگار میں شائع کرایا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نیاز فتح پوری نے سید سلیمان ندوی کی خوب خوب خبر لی۔ اور ان گہرے زخموں کا حساب چکایا جو اکثر موقعوں پر مذہب کے معاملے سید صاحب نے نیاز صاحب پر لگائے تھے۔ نیاز صاحب نے ایک اور فائدہ بھی اٹھایا۔ شبلی کی زندگی کے اس پہلو پر طویل بحث کی، اور ایک ٹربیونل بھی بٹھایا جس کا فیصلہ بھی نگار میں چھپا۔ یاد ایام کے سلسلے میں علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر سید سلیمان ندوی کا خط بھی نگار

میں چھاپا گیا، اور امین زبیری صاحب کی طرف سے بھی اس میں کچھ اضافے کیے گئے۔ بعد ازاں یہ مضمون ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں چھپا، جن پر بعض لوگوں نے تبصرے کیے۔ ان میں سے قاضی عبدالغفار (مصنف لیلیٰ کے خطوط)۔ عبدالماجد دریابادی۔ مولوی احمد مکی صاحب کے تبصرے قابل ذکر ہیں۔ شیخ اکرام نے بھی شبلی نامے میں اس پر لکھا۔ اس سلسلے میں جو اعتراضات ہوئے ان کا جواب یہاں فردا فردا دیا جاتا ہے۔

خالد حسن صاحب قادری لکھتے ہیں:

"ہم فاضل مقالہ نگار وحید قریشی کے اس جذبے کو مستحسن نگاہ سے نہیں دیکھتے، جو شبلی کو دوسرا سرسید بننے کی ایک بے چین خواہش، اور عطیہ بیگم کے ساتھ ایک رنگین معاشقہ کا اتہام عائد کرنے میں کارفرما ہے۔"

یہ لکھنے کے بعد فاضل معترض نے اتنا بھی نہیں کیا کہ سرسید بننے کی خواہش کے خلاف ایک آدھ دلیل یا کم از کم ایک آدھ ثبوت مہیا کر دیتے۔ میں نے اس کی بنیاد شرر کے دیباچہ نظم شبلی اور مہدی حسن کے "شبلی کی معاصرانہ چشمکیں" (یاد ایام کا اس میں اضافہ کیا جاسکتا ہے) پر رکھی تھی۔

مہدی حسن کا اصل فقرہ یہ تھا:

" یہ بات غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی مفرط خود داری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ لیا۔"

معلوم ہوتا ہے یہ فقرہ خالد حسن صاحب کے پیش نظر بھی تھا۔ اسی لیے تو وہ سرسید کے گروپ سے شبلی کے تعلقات سے بچ بچا کر نکلتے ہوئے مولانا شبلی اور خودی کے موضوع پر لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس مضمون میں آخر

تک پتہ نہیں چلتا کہ فاضل مقالہ نگار کا خودی سے مقصد وہی احساس خود داری ہے جس کا ذکر مہدی حسن نے کیا ہے 'یا اس سے مراد اقبال کا فلسفہ خودی ہے (یاد رہے موخرالذکر میں موسیقی کے لیے کوئی گنجائش نہیں) اور شبلی بقول خالد اس لحاظ سے بے عیب ہیں کہ ان کے کردار میں کوئی خامی ہو سکتی ہے۔ خیر تضاد کو چھوڑیے۔ آگے چل کر خالد حسن لکھتے ہیں:

" بات اصل میں یہ ہے کہ مجازی محبت بھی انساں کی طبیعت کو درد مند بنا دیتی ہے اور اس کی طبیعت میں ایک قسم کا سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے ..... قلب میں ایک تجاذبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے..... غرض عشق مجازی سے دل میں لطف اور سچے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور قلب کے اندر صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں کہ اس کے اندر صفات الٰہیہ کی تجلیات منعکس ہو سکیں..... (تجاذبی کیفیت کے ساتھ) انفعالیت 'سپردگی 'سوز و گداز ' رقت قلب بھی پیدا ہونا ضروری ہے اور یہ محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت خواہ انسان کی ہو یا خدا کی۔"

اقبال کے فلسفہ خودی اور عام تصوف کی شاہراہ میں جو بنیادی فرق ہے وہ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ البتہ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ شبلی صوفی تھے یا نہیں۔ میرے خیال میں علامہ کی تحریر و تقریر کہیں سے بھی ان کے صوفی ہونے کی شہادت بہم نہیں پہنچائی جا سکتی۔ البتہ ان مذہبی تحریکات کے زیر اثر اور احیاء مذہب کے طور پر شبلی بھی اپنے معاصرین کی طرح سائنس اور مذہب میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس لیے ان کی نگاہ انتخاب معتزلہ پر پڑی اور اس طرح وہ اس نئی معتزلی تحریک کے بانی ہوئے 'جو انہیں

کے ساتھ ختم ہو گئی۔ انہیں صوفی سمجھنا یقیناً ان کی توہین ہے۔

خودی 'عشق مجازی ' آئیڈیل عورت' اس طرح کے تصور پیش کرنا جن میں آپس میں تضاد ہو یقیناً علامہ کے بارے میں کسی قطعی رائے پر پہنچ سکنے کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے متذکرہ بالا اصلاحات کا مفہوم بھی معترض کے ذہن میں معین نہیں۔ انہیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ شبلی اقبال کے مرد مومن تھے۔ یا نیٹشے کے فوق البشر یا نسلی کے انسان۔

خالد حسن صاحب شبلی کو صوفی ماننے کے بعد ان کے موسیقی سے شغف کو آسانی سے جائز قرار دے سکتے تھے۔ حیرت ہے انہوں نے اس موقع پر ان پر دو عملی کا الزام کیوں لگایا اور ان کا یہ کہنا کہ شبلی عطیہ والے خطوط میں لیے دیے سے رہتے ہیں اور بھی حیرت انگیز ہے 'کوئی کھلی ہوئی بات سے انکار کر دے تو میں اسی شخص کو تو صوفی مان سکتا ہوں 'لیکن اس کے بارے میں تب بھی مجھے اختلاف رہے گا۔

وہ شبلی کو صوفی کے علاوہ ریفارمر بھی مانتے ہیں۔ یہاں وہ دبے لفظوں میں شبلی کو پیغمبر بنانا چاہتے ہیں کیونکہ " صوفی وہ ہے جو ذہنی ارتقا کی منزلیں طے کر کے واپس نہیں آتا 'اور پیغمبر وہ ہے جو روحانی بلندیاں حاصل کر کے واپس آتا ہے 'اور خدمت خلق پہ کمر بستہ ہو جاتا ہے۔"

میرے خیال میں فلابیر کی طرح ان کی محبت مادی تھی۔ اور مادم X کے مقابلے میں انہوں نے عطیہ اور ابوالکلام آزاد کا آئیڈیل تراشا تھا 'جو خود انہی کی ذات کا ایک پرتو ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کی اس افتاد طبع کو ان کی خامی تصور کرنا صحیح نہیں۔ خامی تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مولانا کی شخصیت میں کہیں تضاد نہیں۔ ان کا ہر فعل ' ان کی ہر بات ایک ہی مرکزی نقطے سے متعلق ہے۔ اگر آپ ان کی زندگی کے مختلف واقعات کو ایک دوسرے کی روشنی

میں دیکھنے کی کوشش کریں گے ' تو یقیناً اسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

خالد حسن صاحب کے بھڑکنے کی وجہ تو صرف اتنی سی ہے کہ وہ شبلی میں ایک ایسی بات نہیں دیکھنا چاہتے تھے جو ان کے اپنے تصور اخلاق کے خلاف ہو۔ اس لیے جب "جنس" کا لفظ استعمال کیا گیا تو خالد صاف بھڑ گئے۔ انہوں نے میرے مضمون کا یہ فقرہ نقل کیا تھا:

" یہاں پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب میں تھا تو اس کے ساتھ ہی جنسی پہلو ابتدا ہی سے نمایاں تھا..... "

پورا پیراگراف یوں ہے:

"یہاں اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کے ساتھ ہی اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا ' ہم فارسی شاعری کے سارے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مولانا کے کلام کو غور سے پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اشعار سوچ بچار کے لمحوں میں مولانا کے تخیل کا اعجاز ہیں ' اور ان کے تخیل کی بے باکی پر دال۔ ورنہ وہ تو خود کہتے ہیں..... "

(رسالہ ادبی دنیا مئی 1945ء ص 75' اصل کتاب ص 86)

اس موقع پر جیسا کہ قارئین کو معلوم ہوگیا ہوگا میں نے "جنس" کا لفظ مباشرت کے معنوں میں قطعاً استعمال نہیں کیا ' اور اس گرمئی جذبات کو "تخیل" ہی کا اعجاز کہا ہے۔

"جنس" کا لفظ نفسیات میں جنسی فعل کے معنوں میں کبھی نہیں آتا۔

البتہ اس بات کا خالد صاحب کو گلہ اب بھی ضرور ہونا چاہئے کہ تخیل کی معجزہ کاری کو میں نے دسمبر 1908ء تک برقرار جانا ہے ' اور اس کے بعد کہیں بھی "جنس" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔

شیخ اکرام شبلی نامہ میں (ص 151) لکھتے ہیں:

" اس قسم کے اشعار کو دیکھ کر مسٹر عبدالوحید قریشی جنہوں نے شبلی کی حیات معاشقہ پر رسالہ کتاب بابت اپریل 1945ء میں ایک تفصیلی مضمون لکھا ہے رقمطراز ہیں "اگر مولانا کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا تو اس کا جنسی پہلو بھی ابتدا ہی سے نمایاں تھا" ہمارا خیال ہے اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاق شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ انہوں نے کئی چشموں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اور اخیر میں عام طور پر ان کا مذاق بے حد سلجھ گیا تھا۔ لیکن ان کی ابتدائی تربیت "اودھ پنچ" اور "پیام یار" کے صفحات سے ہوئی تھی اور یہ اثر اخیر تک کچھ نہ کچھ قائم رہا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار سے شبلی کی محبت کے جنسی یا غیر جنسی پہلوؤں پر رائے قائم کرنا صحیح نہیں۔ ان میں وہ فقط ہماری شاعری کی بعض سقیم اور مبتذول روایات کو نباہ رہے ہیں..... "

یہاں فاضل معترض نے پیرے کا ابتدائی حصہ نقل کیا ہے۔ حالانکہ دیانت داری یہ تھی کہ سارا پیراگراف لکھا جاتا۔ اکرام صاحب نے جو اشعار پیش کر کے مجھ پر الزام لگایا ہے ' اگر وہ غور سے دیکھیں تو مضمون کے اندر ہی انہیں اس کا جواب مل جائے گا۔ میرے اور ان کے بیانات میں مطلق کوئی

فرق نہیں ہے۔ یہ اشعار سارے کے سارے جن پر اپنے اعتراض کی بنیاد انہوں نے رکھی ہے " دستۂ گل " سے مستعار ہیں "بوئے گل " سے نہیں۔

کج بحثی کی ساری خرابیاں "جنس" کے لفظ سے پیدا ہوئی ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر معترضین Sex کے لفظ کے لیے فرائڈ سے رجوع کریں۔ کیونکہ اس کا صحیح مفہوم نائٹ لٹریچر (Night Literature) میں نہیں 'بلکہ نفسیات کی کتابوں میں ملے گا۔

شیخ اکرام صاحب نے ص 155 پر ارشاد فرمایا ہے:

"ہمارے خیال میں عطیہ بیگم صاحبہ کے اس اظہار کو بغیر کسی تامل و تردد کے درست مان لینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ خطوط شبلی اور غزلیات بمبئی میں ایک آگ بھڑکتی ہے۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی عطیہ بیگم صاحبہ نے کوئی بھی کوشش کی تھی۔"

ہم نے اپنے مضمون میں یہ کہیں نہیں کہا کہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اس آگ کو شعلہ زن رکھنے کی کوشش کی۔بلکہ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ انہوں نے مولانا کو 1910ء سے پہلے تک Discourage نہیں کیا 'اور مولانا کو شاعری میں کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ اشعار کی تشریح سنی 'اور نہ صرف ان اشعار کی تشریح کو پسند کیا 'بلکہ اشعار کی داد بھی دی۔ اور اس داد کو جواباً وصول بھی کیا 'جو شبلی نے ان کی داد پر دی۔ " ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہوگا " اور پھر اسی خط میں " عطیہ بار بار جی چاہتا ہے کہ تم کوئی چیز طلب کرو اور میں یہاں سے بھیجوں کیا لکھنئو میں کوئی چیز تمہارے قابل نہیں۔"

اب بتایئے ہم یہ کیسے مان جائیں کہ عطیہ بیگم علامہ شبلی کی اس عشق سے بے خبر تھیں۔ وہ اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

"اب تھوڑا عرصہ ہوا میرے علم میں آیا کہ کسی زمانہ میں مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان ندوی نے بھی ان کے خطوں کا ایک مجموعہ "مکاتیب شبلی" کے نام سے شائع کیا تھا 'اور اسی میں بعض ایسے خطوط شائع کیے 'جن سے ہمارے نام کے خطوط کے ساتھ ربط اور سلسلہ ہے 'اور میری ذات و شخصیت کے متعلق اشارے ہیں۔ ان خطوں سے ادیبوں اور افسانہ نگاروں کو بھی ایک بڑا مواد اور مشغلہ ہاتھ آگیا ہے۔ ریڈیو پر تقریر ہوئی اور اردو رسائل میں مضامین شائع کیے گئے۔ اگرچہ ہمارے خطوں میں تو کوئی ایسی بات نہ تھی۔ البتہ مکاتیب شبلی کے خطوں کے ساتھ پڑھنے سے بے شک یہ مواد ملتا ہے۔ مولانا ایک شریف گھرانے میں ایک عالم ' ایک بزرگ اور ایک بہت بڑے مذہبی مشن کے مبلغ کی طرح جاتے ہیں۔ جہاں بڑی عزت سے استقبال ہوتا ہے 'لیکن ان کے دل میں اور ہی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ جن کو ایسے راز دار دوستوں کے خطوں میں ظاہر کرتے ہیں 'جو مہذب تعلیم یافتہ اور عالم بھی ہیں 'اور یہ بزرگ ان خطوں کو اشاعت کے لیے نذر کردیتے ہیں۔ اور ان کے جانشین بھی جو علم و اخلاق اور ادب کے اعتبار سے کافی شہرت رکھتے ہیں ان کو شائع کرتے ہیں 'اور یہ بھی نہیں سوچتے

کہ اس طرح وہ لائبل کے جرم کا ارتکاب کررہے ہیں۔
کیا اسی معیار شرافت پر ان عالموں اور فاضلوں کو ناز ہے؟
ان کو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچنا چاہئے تھا کہ اگر ان
کے خاندان کی خواتین اس پوزیشن میں ہوتیں تو وہ ایسے
خطوط کی اشاعت گوارا کرتے؟ انہوں نے یہ بھی غور کیا
ہوتا کہ خود مولانا شبلی کے اخلاق کے متعلق دنیا کیا رائے
قائم کرے گی..... ہم نے ان خطوں کو جو ہمارے نام آتے
تھے ہمیشہ معصومانہ روشنی میں دیکھا..... واقعی سعدی کا یہ
قطعہ کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ :
" انسان کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہوجاتا ہے لیکن
نفس کی خباثت برسوں میں بھی نہیں معلوم ہوتی اور ہم
اس علم و لاعلمی میں رہے۔"

(ادبی دنیا جولائی 'اگست 1946ء)

اس اقتباس میں دلائل سے زیادہ جذبات کا استعمال ہوا ہے۔ اور مولانا شبلی کی ذات پر بعض نازیبا اور ناواجب حملے کئے گئے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی ضرور تھے 'لیکن" خبیث" نہ تھے۔ باقی رہے سید سلیمان ندوی تو خطوط کی اشاعت کی جتنی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے 'اتنی ہی خطوط شبلی کی اشاعت امین صاحب پر ہوتی ہے۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا 'اور نہ اب کہتے ہیں کہ اس معاشقے میں عطیہ بیگم صاحبہ کا قصور تھا۔ خطوط و اشعار اکثر شبلی کی داخلی کیفیات ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ متذکرہ بالا اقتباس میں لاعلمی پر جو ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے 'ہمیں سوچنے پر ضرور مجبور کردیتا ہے۔ اور ہم علامہ شبلی اور علامہ اقبال کے ان جملوں کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں 'جن

میں عطیہ صاحبہ کو ذہین و فطین کہا گیا ہے۔

امین زبیری صاحب جن کا شکریہ محترمہ عطیہ بیگم صاحبہ نے اپنے مضمون میں ادا کیا ہے۔ ان کی کتاب "تبصرہ حیات شبلی "یعنی شبلی کی زندگی کا ایک رنگین ورق پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدیر "صدق "لکھتے ہیں۔

"یہ تبصرہ شبلی کی زندگی کے رنگین پہلو پیش
کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن خود تبصرہ نگار کے مذاق طبیعت
کی غمازی یقیناً کررہا ہے۔"

اسی طرح قاضی عبدالغفار مدیر "پیام" (مصنف لیلیٰ کے خطوط و مجنوں کی ڈائری) اپنے فکاہی کالم میں رقمطراز ہیں:

" علی گڑھ کے کوئی محمد امین زبیری صاحب شاید وہی جنہیں ہم جانتے ہیں!! ان بزرگ نے ایک چو ورقہ (جس کی قیمت 6 آنہ ہے) شائع فرمایا ہے۔ اس کا عنوان " تبصرہ حیات شبلی" ہے اور اس عنوان کی توضیح یوں فرمائی گئی ہے کہ " یعنی مولانا شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو" اس تبصرے میں حسن و عشق کے کچھ قصے مرحوم مولانا شبلی کی سوانح حیات سے منسوب کئے گئے ہیں۔ علی گڑھ کے "بالشتیوں کی بستی" میں امین زبیری صاحب (اگر یہ وہی ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں) بہت بڑے سوانح نگار اور مؤرخ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہمیں آج تک معلوم نہ تھا کہ اس چو ورقہ کی اشاعت کے بعد اس کی قیمت 6 آنہ ہے 'اب تو ہمیں جناب زبیری صاحب کی عریانیت کا لحاظ مقدم کرنا ہی پڑے گا۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ مورخ علی گڑھ اپنی سوانح نگاری کی مساعی کو اپنے گھر کے قریب 'یعنی اپنے محلے ہی سے شروع فرمائیں ..... ہم انہیں بتا سکتے ہیں کہ ان کی علمی کاوشوں کے لیے بہت کافی مواد علی گڑھ ہی

میں موجود ہے..... اگر یہ وہی زبیری صاحب ہیں جنہیں ہم کسی زمانے میں ایک مصنف اور مولف کی حیثیت سے جانتے تھے، تو وہ بیچارے تو اب ایک ضعیف العمر بزرگ ہوں گے۔ اس بڑھاپے میں حسن و عشق کی وقائع نگاری کا یہ شوق حسرت ناک ہے!!

..... تبصرہ نگار کے مذاق اور افتاد طبیعت کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی بجائے ہم تو صرف اتنی بات عرض کریں گے کہ کچرے اور غلاظت کی سودا گری (چار ورق چھ آنے میں) ..... علی گڑھ کے ماحول میں ذرا بھی تعجب انگیز نہیں! "تاریخ بھوپال" اور "تذکرہ وقار" کے مولف کی یہ افتاد اگر ان کے ماحول کی بوڑھی رنگینئی افکار کا نتیجہ سمجھی جائے تو وہ ہماری رائے میں مذمت اور تنقید سے بالاتر ہے!! گولر کی شاخوں میں انجیر کیوں تلاش کیجئے!!

..... ثقافت اسلامی (فی الہند) کے مرکز پر جب اس قسم کی رنگینیاں ڈیڑھ آنے کے حساب سے بک رہی ہوں، تو پھر ان پھولوں سے ہی اس چمنستان کی بہار کا اندازہ کر لیجئے!

زبیری صاحب کی روایت و درایت کا رخ ذرا بدل دیجئے تو یہ سلسلہ علی گڑھ کے کیسے کیسے مقامات اعلیٰ تک پہنچتا ہے..... جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔

(روزنامہ پیام 6 جون 1946ء، اصل کتاب ص 94)

یہ تو اچھا ہوا کہ گالیاں دینے والے ان علمائے کرام نے شبلی کی زندگی میں اس واقع کے ہونے کا اقرار کر لیا۔ عین ممکن تھا وہ اس سے بھی انکار کر جاتے۔ اب ممکن ہے کہ یہ لوگ شبلی کو صوفی ثابت کریں۔ اور ہم سب ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں۔ مولوی احمد مکی صاحب لکھتے ہیں:

"میں نہیں سمجھتا کہ حسن پرستی یا بالفاظ دیگر اچھی اور خوبصورت چیز

کو بہ نظر پسندیدگی دیکھنا کون سی بری بات ہے۔ جو علامہ سلیمان اس طرح کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں۔

عربی میں ایک مشہورہ محاورہ یہ ہے کہ: "اللہ جمیل و یحب الجمال" اگر ہمارے خیالات میں پاکیزگی ہماری روح میں صفائی اور ہماری نظر میں تقدس ہو تو حسن مجازی کے پردے میں حسن حقیقی کا پرتو دکھائی دیتا ہے اور جب جبین نیاز میں سجدے تڑپتے ہیں تو حقیقت منظر کو لباس مجاز ہی میں دیکھنے کی تمنا ہوتی ہے۔ میں مولانا شبلی کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے ان کی رنگین مزاجی اور حسن پرستی کو ایک فعل محمود سمجھتا ہوں۔ اور ان کا یہ ذوق لطیف ہی انہیں دوسرے ملانوں حتیٰ کہ خود سلیمان ندوی سے بھی ممتاز اور قابل عظمت بناتا ہے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ ان کی نگاہیں حسن مجازی کے ظاہری عشوہ و انداز میں پھنس کر معصیت عمل تو کجا معصیت خیال کی بھی مجرم نہ ہو سکی ہوں گی۔

(ہماری کتابیں اگست ستمبر 1946ء)

..... یقولون بالسنتھم مالیس فی قلوبھم

(وہ زبانوں سے جو کچھ کہتے ہیں ان کے دل میں نہیں ہوتا)

ضمیمہ

عبدالرزاق مصنف "البرامکہ" کی "یاد ایام" کا مسودہ جب سید سلیمان ندوی صاحب کے پاس پہنچا تو انہوں نے انھیں ایک خط لکھا۔ جو نگار اکتوبر 1945ء سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ اس خط میں مولانا کے آغاز شباب کے جن واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یاد ایام (مطبوعہ دسمبر 1946ء) میں ان کے سوائے آخری سطر کے کوئی سراغ نہیں ملتا:

46 دارالمصنفین اعظم گڑھ مورخہ 21 مارچ 42ء

مکرم۔ السلام علیکم:

یاد ایام کی اصل اور کاپیاں واپس مرسل ہیں۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ آپ نے مولانا شبلی کے حال میں

نہایت بے تکلفی سے بعض واقعات نقل کئے ہیں جو احباب کے لیے اور وہ بھی آغاز شباب کے لیے ہوتے ہیں " دور جوانی اختد چناں کہ تودانی" مگر اب وہ اواخر عمر میں ایک مقدس کام کے بانی ہوئے تو ان کا تذکرہ کرنا اور لکھنا بالکل نامناسب ہے۔ گناہ کا ستر چاہئے نہ کہ تشہیر۔ اس لیے ازراہ عنایت بلکہ اس دوستی کے واسطے سے جو آپ کو مولانا مرحوم سے تھی۔ یہ عرض کرتا ہوں کہ ان واقعات پر پردہ ڈالئے تاکہ ان کا نیک نام ضائع نہ ہو اور یوں بھی عیب و گناہ کا برملا اظہار اور فخر مسلمان کے لیے زیبا نہیں۔ والسلام

سید سلیمان

آپ کا یہ فرمانا کہ عطیہ بیگم کی علمی قدردانی نے مولانا کی فارسی شاعری میں نئی روح پھونک دی تھی 'بالکل غلط واقعہ ہے۔ غزلوں کا آغاز 1905ء سے ہوا ہے اور خطوط و ملاقات کا سلسلہ 1908ء سے ہے۔

ضمیمہ

مولانا (عرفان) آگے آگے تھے، میں پیچھے پیچھے۔ اب ہم ایک کشادہ اور شاندار ہال میں پہنچے۔ استقبال کیلئے سفید لباس میں ملبوس ایک کہن سالہ خاتون آگے بڑھیں بال سفید، چہرہ ضعیفی کا آئینہ دار لیکن اداؤں میں شوخی، انداز گفتگو میں بیباکی، حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کی انفرادیت۔ مولانا نے ان سے میرا تعارف کرایا "یہ خلافت کے ایڈیٹر جعفری صاحب!" پھر مجھ سے فرمایا "یہ ہیں عطیہ بیگم فیضی" عطیہ بیگم ..... کتنا دل آویز نام ہے اور اس نام کے ساتھ کتنی رنگین حکایتیں اور کتنی ہوشربا کہانیاں اور کتنی دلچسپ داستانیں وابستہ تھیں..... یہ بوڑھا مجسمہ جس میں آج نہ کوئی رعنائی ہے نہ زیبائی، نہ دلکشی ہے نہ سحر طرازی۔ اپنے زمانے میں کیا کچھ نہ تھا یہ بے رس آنکھیں جس کی طرف اٹھ جاتی تھیں، قتل عام شروع ہوجاتا تھا ..... میں اپنے حافظہ پر تاریخ ماضی کے اوراق الٹ رہا تھا کہ عطیہ بیگم نے تپاک کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"آپ تو آج پہلی بار ہمارے ہاں آئے ہیں۔ آیئے میں آپ کو اپنے مکان کی سیر کراؤں۔"

رئیس احمد جعفری

(دیدہ شنید 572'573)

Rs. 350

"غازہ خور"

گزشتہ رابع صدی کی وہ تاریخ ہوفکشن کے انداز میں عوامی سطح پر پہلی بار لکھی گئی۔ پاکستان میں جدید ناول نگاری کا آغاز اسی ناول سے ہوتا ہے۔

Rs. 250

"آدھی روٹی کافی ہے"

ہندوستان اور سری لنکا کے پس منظر میں لکھا گیا وہ ناول جسے بطور سفرنامہ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔

Rs. 225

"دِلی"

ہندوستان کے مایہ ناز رائٹر خوشونت سنگھ کا وہ شاہکار ناول جس میں صدیوں پر محیط تاریخ اس خوبی کے ساتھ سمودی گئی ہے کہ خوشونت سنگھ اسی "دلی" کے پائے کا دوسرا ناول اب شاید تحریر میں نہیں لا سکتے۔

''علامہ (شبلی) کی کملی اور ڈھکی ہر طرح کی زندگی سے مولانا ابوالکلام آزاد خوب واقف تھے۔'' سلطان حیدر جوش

''شبلی نعمانی کی حیات معاشقہ کوئی راز کی بات نہیں رہی ہے۔ آج سے تقریباً بارہ سال پہلے میرے استاد مولوی محمد مہدی صاحب مرحوم مجھے تمام تفصیلات سنا چکے تھے۔'' مولوی احمد مکی

''علامہ شبلی انکار کے جائیں لیکن ہم کو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شیوہ و لپلپر یہ وہ

''تہمت دوستاں'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعرانہ طبیعت بہرہ وافر رکھتی ہے۔''

''شبلی اگر اپنا راز چھپاتے ہیں تو مصلحت کی بناء پر۔ وہ عوام سے ڈرتے تھے۔'' مولانا حسرت موہانی

''علی گڑھ کے طلباء میں ''شبلی'' عموماً غیر ہر دل عزیز تھے۔ ان کو طلباء خشک اور مغرور سمجھتے تھے۔''

''غالب کی طرح شبلی کی حد سے بڑھی ہوئی خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہ تھی۔ شبلی نے ''الکلام'' لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا۔'' مہدی حسن

''کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اس شخص (شبلی) کا کلام ہے جس نے ''سیرۃ النعمان''

''الفاروق'' اور ''سوانح مولانا روم'' جیسی مقدس کتابیں لکھیں۔ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔'' مولانا الطاف حسین حالی

''یوں تو صرف تمہارے لئے وداعیہ غزل خیر مقدم وغیرہ لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے۔ میرا ہر رونگٹا اور ہر موئے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے۔''

شبلی کا عطیہ کے نام مکتوب

''جہنم دا آؤ۔ اور جب چاہو واپس جاؤ۔'' عطیہ فیضی کا جواب

''مولانا شبلی کا ''ندوہ'' میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا تھا اور ان پر علماء کی طرف سے جو الزامات عائد کئے گئے تھے ان میں ابوالکلام آزاد کی ''محبت'' بھی تھی۔''

''مہدی حسن سے انھوں نے لاکھ کہا کہ وہ انہیں اپنے گھر بلائیں اور اپنی نئی بیوی سے متعارف کرائیں لیکن وہ بچہ بدک گئے تھے۔ اس لئے کہ عطیہ والے معاملے میں راز دار وہی تھے۔''

ٹی اینڈ ٹی پبلشرز

31-S-101/E بنک کالونی، سمن آباد، لاہور فون: 042-7576894

ISBN NO: 969-8305-45-9